ماہنامہ

قومی ڈائجسٹ

لاہور

مئی 2020

عامر خاکوانی کی کہانی
خود ان کی زبانی

میرا پی ایچ ڈی مقالہ ملکہ شہر پر
تھا، یوں لگتا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت
میری مدد کر رہی تھی۔ یہ کام صرف
18 ماہ میں مکمل ہو گیا تو یونیورسٹی
میں حیرت کا اظہار ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے!

منموہن سنگھ نے اعتراف کیا کہ
نواز شریف کی 1992ء والی
معاشی اصلاحات کو انہوں
نے من و عن اپنا لیا

ممتاز ماہر معاشیات ڈاکٹر حفیظ احمد پاشا کی چشم کشا باتیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قوم کے ہر فرد کی آواز

پاکستان

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور

مئی 2020 ◉ جلد 42 ◉ شمارہ 5

چیف ایڈیٹر
مجیب الرحمن شامی

ایڈیٹر
عثمان شامی

مینجنگ ایڈیٹر
علی شامی

سینئر ایڈیٹر
خالدہ ہمایوں

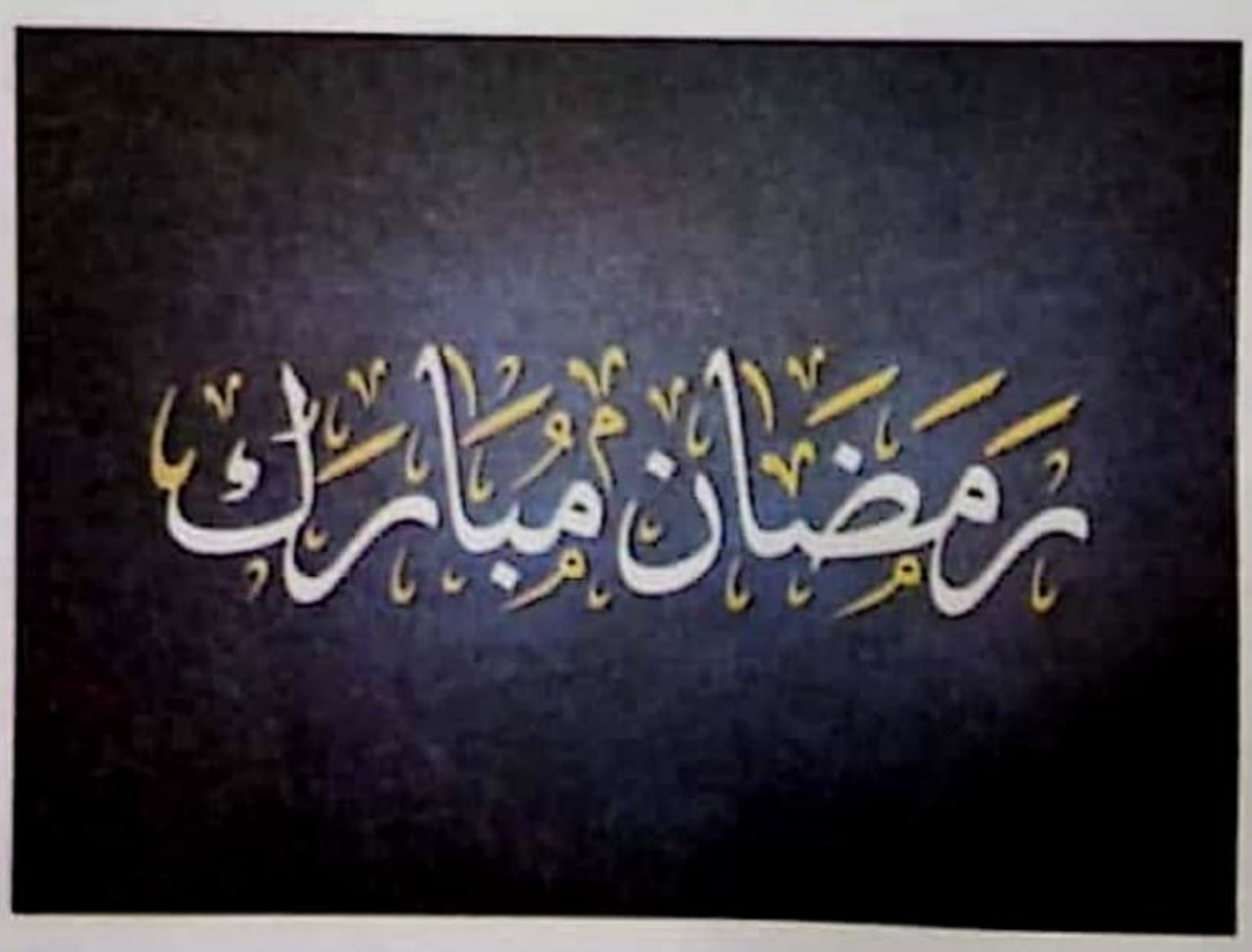

قیمت پاکستان: 100 روپے۔ سالانہ چندہ: بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1440 روپے، بذریعہ عام ڈاک 1000 روپے۔ متحدہ عرب امارات: 11 درہم۔ سعودی عرب: 11 سعودی ریال
بیرون ملک بدل اشتراک: سعودی عرب، یو اے ای، بحرین، قطر، تھائی لینڈ، چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور، مالدیپ، ڈنمارک، ناروے، فرانس، سویڈن، ہالینڈ، بیلجیم، یونان، جرمنی، برطانیہ 4000 روپے، انڈونیشیا، ملائیشیا، نائجیریا، جنوبی افریقہ، بھارت، لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش 4000 روپے، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ 4500 روپے

خط و کتابت کا پتہ: دفتر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ 41 جیل روڈ لاہور، فون: 042-35404061-65
فیکس: 042-35404066-67
Email
qaumidigestpak@gmail.com

مجیب الرحمن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس سے چھپوا کر 41 جیل روڈ لاہور سے شائع کیا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس شمارے میں

انٹرویو — ڈاکٹر حفیظ احمد پاشا — حامد ولید — 9

یادداشتیں — ممتاز تجزیہ کار اور کالم نگار عامر خاکوانی کی کہانی خود ان کی زبانی — قلم بندی: عبدالستار اعوان — 59

اداریہ — کچھ کرنے کا وقت — خالد ہمایوں — 6

طب و صحت — بچے کی نشوونما 6 سال کی عمر تک — 29

سیر و سیاحت — ہنزہ کے رات دن — عمران الحق چوہان — 49

طنز و مزاح — لطائف — ایثار رانا — 58

حیوانیات — شیر — ڈاکٹر وقار علی گِل — 131

کہانیاں

انتظار — غلام فرید کاٹھیا — 39

احساس کی کڑی دھوپ — محمد اقبال فیروز — 122

دلہن — حمید اللہ حمیدی — 127

سانو — ترجمہ: ڈاکٹر بصیرہ عنبرین — 138

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا — —— شاہد لطیف — 143

چنری ست رنگی — سعیدہ افضل — 169

خود گزیدہ — طارق بلوچ صحرائی — 173

زراعت کی دنیا — چھوٹے کسان کے دن کب بدلیں گے؟ — طاہر جودھیانہ — 31

سائنسی اُفق — ماحولیاتی تبدیلی کی باتیں سچ یا جھوٹ؟ — نصیر احمد ورک — 133

اسلامیات — شیطان — اسد الرحمان قدسی — 165

مطالعہ کی میز — قادیانیت کا حدود اربعہ — رائے ارشاد اللہ کمال ایڈووکیٹ — 151

ڈاکٹر اے آر خالد کی کتاب "کرسیوں کے چند کیڑے ملک سارا کھا گئے" چند تاثرات — عمران امین — 178

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یادداشتیں

ممتاز تجزیہ کار اور کالم نگار

عامر خاکوانی

کی کہانی خود ان کی زبانی

قلمبندی: عبدالستار اعوان

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عامر خاکوانی کو اردو صحافت میں باقاعدہ آئے 24 برس ہو چکے ہیں۔ 1993ء میں ان کا پہلا کالم روزنامہ جنگ میں شائع ہوا اور اس کے بعد ان کے جنوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ 1996ء میں اردو ڈائجسٹ جوائن کیا۔ روزنامہ ایکسپریس اور روزنامہ دنیا جیسے قومی اخبارات کی بانی ٹیم کا حصہ رہے۔ گزشتہ تین برس سے روزنامہ 92 نیوز میں بطور میگزین ایڈیٹر، کالم نگار کام کر رہے ہیں۔

عامر خاکوانی ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے برسوں کی ریاضت کے بعد صحافت اور کالم نگاری کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ اپنے کالموں میں کئی نئے تجربات کیے اور اردو کالم کا کینوس وسیع کرنے کی کوشش کی۔ کرنٹ افیرز، ادب، تاریخ، تصوف، روحانیت، سیاست اور سماجی اشوز سے لے کر سپورٹس، دہشت گردی، اور موٹیویشنل موضوعات پر بہت لکھا۔ مختلف موضوعات پر ان کے مطالعہ کا میدان بے حد وسیع ہے۔ ان کے منتخب کالموں کے دو مجموعے ''زنگار'' اور ''زنگار نامہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ شدت پسندی و عسکریت پسندی پر ایک تحقیقی کتاب زیر طبع ہے، انٹرویوز اور فکری مضامین پر مشتمل دو کتابیں بھی زیر طبع ہیں۔

میں جناب خاکوانی کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ ان کے اس پیش قیمت بیانیے میں ایک اعتبار سے پاکستانی معاشرے، سیاست اور صحافت کی گزشتہ تین دہائیوں کی حشر ساماں تاریخ سمٹ آئی ہے۔ کئی گوشے تو خاصے چشم کشا ہیں۔ مجھے امید ہے قارئین لطف اندوز ہوں گے۔ (عبدالستار اعوان)

خاندانی پس منظر

میں یکم جولائی 1971ء کو تحصیل احمد پور شرقیہ، ضلع بہاولپور میں پیدا ہوا۔ میرے نام کے ساتھ خاکوانی اس لئے لگتا ہے کہ میرا تعلق سرائیکی پٹھانوں کے قبیلے خاکوانی سے ہے۔ خاکوانی اپنے نام کے ساتھ ''سردار'' لکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہمارے اجداد کا تعلق افغانستان کے صوبہ ننگر ہار کے علاقہ خوگیانی سے ہے۔ خوگیانی سے لفظ خوگانی بنا، جو بگڑے بگڑتے خاکوانی ہو گیا۔ اصل میں ہم معروف زئی پٹھان ہیں، مگر اب خاکوانی کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ خاکوانیوں کا ایک حصہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان آیا، کچھ اس سے پہلے بھی آ چکے تھے۔ ابدالی نے ریاست ملتان کی حکومت پٹھانوں کو سونپی۔ سدوزئی اور خاکوانی ملتان کے نواب رہے ہیں۔ ملتان کے آخری نواب مظفر خان سدوزئی کے ساتھ بعض خاکوانی کمانڈر بھی سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ نواب مظفر خان سدوزئی ٹیپو سلطان کی طرح کی ایک زبردست شخصیت تھے۔ وہ 80 سال کی عمر میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے، یہ بہادری اور دلیری کی ایک بہت بڑی مثال ہے کہ اس قدر بوڑھا انسان جذبہ ایمانی سے سرشار ہو کر باقاعدہ جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ ضلع مظفر گڑھ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ سکھوں کے دور میں پٹھانوں پر بڑا ظلم ہوا۔ اسی وجہ سے بعد میں خاکوانیوں نے سکھوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا اور بعض نے انگریزوں سے سینکڑوں مربع زمین پائی، کچھ خاکوانی البتہ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئے۔ وہ انگریزوں کو دشمن سمجھتے رہے اور جائیدادوں سے محروم رہے۔ ہمارے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اخوان المسلمون کے

مرشد عام کا انٹرویو

میری زندگی کا یادگار واقعہ تھا

بزرگوں سمیت بعض خاکوانیوں نے ریاست بہاولپور کا رخ کیا۔ وہاں عباسی نوابوں نے ان جنگجوؤں کی قدر کرتے ہوئے کہا کہ ریاست بہاولپور کے نواب تو ہم ہی ہیں، آپ کو ہم نواب تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن آپ کو سردار کا ٹائٹل دیتے ہیں۔ بہاولپور میں ایک زمانے میں صرف سید، پٹھان اور خود عباسی ریاستی فوج میں کمیشن لے سکتے تھے، ان کے سوا کسی اور کو اجازت نہیں تھی۔ خاکوانی اور دیگر پٹھان ریاستی فوج کا حصہ رہے۔

میرے دادا حافظ غلام محمد خان

میرے دادا حافظ غلام محمد خان نے 1936ء میں وفات پائی۔ وہ اس وقت کے نواب آف بہاولپور کے قریبی ساتھی اور مشیر تھے۔ حافظ غلام محمد خان صاحب معرفت بزرگ تھے۔ ان کی بہت ساری کرامات مشہور ہیں۔ میرے والد صاحب چھ سات سال کے تھے کہ دادا جان کا انتقال ہو گیا۔ نواب بہاولپور ان کی بڑی قدر کرتے۔ نواب صاحب نے ایک بار حافظ صاحب کو ایک چک (کئی سو مربع اراضی) دینے کی پیش کش کی۔ حافظ صاحب میں کمال کا استغنا تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پیش کش مسترد کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو اپنی قبر کے لئے اراضی مل جائے، اسی کو غنیمت سمجھوں گا۔ نواب صاحب نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ حافظ صاحب اپنے بچوں کے لئے لے لیں، ان کے کام آئے گی۔

حافظ صاحب نے اس پر فرمایا، ''میں اپنے بچوں پر بوجھ نہیں لادنا چاہتا، وہ اگر خود چاہیں گے، تو زمینیں بنالیں گے۔'' ہم اپنے والد کو کہا کرتے کہ آپ کے والد گرامی نے اس ایک جملے کے ساتھ ہمیں ایک تگڑا زمیندار بننے سے محروم کر دیا۔ جس خاکوانی کو دیکھو، وہ زمیندار ہے، ایک ہمارا گھرانہ ہی ہے جس کے پاس زمین نہیں۔ والد ہمیشہ مسکرا کر کہتے کہ تمہارے دادا نے اللہ پر توکل کی جو دولت چھوڑی ہے، اس میں سے حصہ لے لو۔ داوا کی کئی کرامتیں بھی مشہور ہیں، ان کی قبر سے منسوب کئی کہانیاں قبرستان سے ملحق گھروں والے بھی بتاتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب)۔ خاکوانی بنیادی طور پر تگڑے زمیندار ہیں لیکن ہمارا خاندان اس جاگیرداری سے دور رہا۔ لیکن یہ اللہ کا کرم رہا ہے کہ اس نے ہمیں کسی بھی شئے کا محتاج نہیں کیا اور ہمیں دنیا کی ہر نعمت سے نوازا۔

بیعت کا تعلق

ہمارا گھرانہ روایتی طور پر بریلوی مسلک سے تعلق رکھتا ہے، خاندان کے بیشتر لوگ خواجگان تونسہ سے بیعت ہیں، والد صاحب خواجہ نظام صاحب تونسوی سے بیعت تھے، ہم بھائیوں کو انہوں نے بچپن میں خواجہ معین الدین تونسوی سے بیعت کرایا، تاہم بعد میں رابطہ نہیں رہا اور اس بیعت کو فالو نہیں کر پایا۔ خواجہ معین صاحب معروف صوفی بزرگ خواجہ سلیمان تونسویؒ کی اولاد میں سے ہیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اوران کے والد کا نام خواجہ نظام الدین تھا۔ یہ سب بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ خواجہ سلیمان تونسوی کو "پیر پٹھان" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل پٹھان تھے اور ہم خاکوانی بھی چونکہ پٹھان ہی ہیں تو اس لیے ہمارے بیشتر لوگ خواجگان تونسہ شریف کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔

والد سردار ہاشم خان خاکوانی

میرے والد سردار ہاشم خان خاکوانی شہر کے سینئر وکیل تھے۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے گریجوایٹ تھے۔ والد صاحب پہلے سکول ٹیچر تھے اور بعد میں ہیڈ ماسٹر بن گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایل ایل بی کیا اور ہیڈ ماسٹری کی نوکری چھوڑنے کے لئے ڈائریکٹر تعلیمات کو درخواست دے دی۔ ڈائریکٹر نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ میرا نام سردار ہاشم خان خاکوانی ہے اور میں اپنے نام کے ساتھ 'سردار' لکھتا ہوں لیکن یہاں جو بھی آتا ہے وہ مجھے 'ماسٹر' کہہ کر پکارتا ہے اور میں اس ٹائٹل سے جان چھڑوانا چاہتا ہوں کیونکہ سردار کو چھوڑ کر مجھے ماسٹر کہلوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ بس اس وجہ سے ابا جی نے یہ نوکری چھوڑی اور وکالت شروع کر دی۔ جلد ہی ان کا شمار لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیلوں میں ہونے لگا۔ والد صاحب بڑے دبنگ انسان تھے، ان کا بڑا رعب داب تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد تھا اور بڑے وجیہہ انسان تھے۔ جناح کیپ ان کی خاص شناخت تھی۔ بڑے خوش مزاج اور خوش لباس تھے۔ شگفتہ باتیں کرتے تھے اور انہیں کہانی سنانے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ بات کرتے تو ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ وہ گھنٹوں گفتگو کرتے تھے اور لوگ ان کے سحر سے نکل نہیں سکتے تھے۔ لوگ ان کی محفل میں بہت دلچسپی سے بیٹھتے تھے۔ وہ اپنی عزت نفس کے بارے میں بہت زیادہ حساس بھی تھے۔

والد صاحب کا صوفیانہ مزاج تھا اور وہ اولیائے کرام کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ توحید کے معاملے میں بھی بہت سخت تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ چشتیاں میں رہتے تھے۔ چشتیاں میں خواجہ نور محمد مہاروی صاحب کی درگاہ بھی ہے۔ وہ اسی درگاہ سے وابستہ تھے۔ وہ بزرگ ایک مرتبہ والد صاحب سے کہنے لگے کہ ہم تو قبر پرست ہیں تو والد صاحب کو ان کی یہ بات بہت بری لگی اور کہا کہ تم قبر پرست ہو گے میں تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ ہم بزرگوں اور اولیائے کرام کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور مزارات پر عقیدت کے ساتھ جاتے ہیں لیکن قبر پرستی کو نہیں مانتے۔ والد صاحب کردار کے بہت مضبوط انسان تھے اور ہمیں ہمیشہ یہی بات سمجھاتے کہ آپ کو اپنا کریکٹر بہترین بنانا چاہیے۔

والد نے کہا اپنی سوچ وسیع کرو

بہاولنگر کے معروف سیاستدان عبدالستار لالیکا والد صاحب کے شاگرد تھے۔ عالم علی لالیکا بھی والد صاحب کے شاگرد تھے۔ یہ نواز شریف کا 1988ء کا دور تھا اور عبدالستار لالیکا نواز شریف کے پنج پیاروں میں شمار ہوتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحب کو خط لکھا کہ میری فلاں قسم کی ضرورت ہو، کوئی کام ہو تو بتایئے۔ ان دنوں ایک دوڑ چلی تھی کہ لوگ بڑے شوق سے اپنے بچوں کو نائب تحصیلدار اور پولیس میں اے ایس آئی بھرتی کروایا کرتے۔ اس زمانے میں لوگ دو لاکھ روپے رشوت دے کر یہ عہدے حاصل کرتے۔ یہ بڑی پرکشش سیٹیں سمجھی جاتی تھیں۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نیب نے سلیکٹو احتساب ہی کیا،

اس کی کارروائیاں مشکوک ہیں

اس نے قوم کو مایوس کیا

میرے بھائی نے ایف اے کرلیا تھا، اس ملازمت کی شرط بھی اس وقت ایف اے تھی۔ انہوں نے والد صاحب کو کہا کہ آپ لالیکا کو کہہ کر مجھے نائب تحصیل دار لگوا دیں۔ اس پر والد صاحب کو بہت غصہ آگیا اور کہنے لگے کہ تمہارا اس قدر چھوٹا لیول کیوں ہے کہ تم لوگ محض نائب تحصیل دار بننا چاہتے ہو، زیادہ سے زیادہ تحصیل دار بن جاؤ گے، بس۔ ہمیشہ ٹاپ لیول پر سوچو اور خود کو صدر پاکستان بنانے پر غور کرو۔ خواب دیکھنا ہے تو بڑا خواب دیکھو۔ تمہیں تو سی ایس ایس کر کے کم از کم 17 گریڈ میں جانا چاہیے۔ والد صاحب ہمیں بچپن ہی سے پی ایچ ڈی کے خواب دکھاتے تھے۔ والد صاحب میں نسلی تعصب تو بالکل بھی نہیں تھا لیکن پٹھانوں کے حوالے سے وہ کہا کرتے تھے کہ جو ہمارے اوصاف ہیں ہمیں ان پر قائم رہنا چاہیے اور شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سخی اور مہمان نواز ہونا چاہیے اور ہمیں کسی قسم کی گھٹیا اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ کرپشن کے بہت خلاف تھے اور بطور وکیل بہت کھرے، صاف شفاف رویہ رکھتے۔ یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی ان سے مالی یا کسی اور ترغیب سے غلط کام کرا سکے۔ وہ کہا کرتے تھے یہ خوبیاں ہمارے آباؤ اجداد کی ہیں جن پر ہمیں قائم رہنا چاہیے۔ جس طرح جوش ملیح آبادی ''پختونی'' کہتے ہیں تو اسی طرح خاکوانی قبیلے میں بھی جو ''پختونگی'' ہے اس کی انا ہمارے اندر ہمیشہ رہتی ہے۔ والد گرامی کو اپنے حسب نسب کے حوالے سے ہمیشہ فخر رہا، مگر اس میں دوسروں کے لئے تحقیر کا جذبہ نہیں تھا، وہ نسب کو ہمیشہ ذمہ داری سمجھتے اور سو فی صد پورا اترنے پر زور دیتے۔

والد گرامی پکے مسلم لیگی تھی

سیاسی طور پر ہمارا خاندان مسلم لیگ سے وابستہ تھا۔ 1977ء میں میں پانچ چھ سال کا تھا جب میرے چچا قومی اتحاد کا ساتھ دینے کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر میں روزنامہ وفاق آتا تھا۔ ہمارے خاندان کی ایک نظریاتی سیاسی کمٹمنٹ تھی۔ والد صاحب جنرل ضیاء الحق کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ افغانستان، کمیونزم وغیرہ کے معاملے میں جنرل ضیاء الحق کے اقدامات کو بہت سراہتے۔ والد صاحب کی ایک رائٹسٹ کے حوالے سے بھی شناخت تھی۔ وہ سادات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور اگر کوئی کلائنٹ سید ہوتا تو اس کا خاص خیال رکھتے اور ان سے کیسوں کے معاملے میں کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ والد صاحب ایک ایماندار وکیل تھے اور ان میں وکیلوں جیسی عادتیں نہ تھیں۔ والد صاحب کو اگر کوئی پیسوں کی پیش کش کر کے کہتا کہ فلاں کیس آپ کے پاس ہے اور آپ یہ رقم لے لیں اور تھوڑا ہاتھ ہولا رکھیں تو اس پر وہ سخت طیش میں آجاتے اور باقاعدہ ''جوتا'' اتار لیتے کہ آپ نے مجھے رشوت کیوں پیش کی ہے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ مجھے خواب میں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی زیارتیں ہوئی ہیں۔ وہ اہل بیتؓ کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ پھر ہم نے لاشعوری طور پر ان سے یہ چیزیں سیکھیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ والد صاحب کا ہم پر بہت زیادہ احسان تھا کہ انہوں نے اپنے کردار سے ہماری بہترین تربیت کی۔ والد صاحب کا انتقال بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال میں 1992ء میں ہارٹ اٹیک کے سبب ہوا۔ اس وقت میں لاء کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔

میری ماں جی

مائیں سب کی اچھی ہوتی ہیں، مگر مجھے لگتا ہے کہ میری ماں کی عظمت فزوں تر ہے۔ انہوں نے زندگی بھر قربانی اور ایثار سے کام لیا۔ رشتے جوڑنے کی کوششیں کرتی رہیں اور ہمیں بھی یہی سبق دیا۔ والد مرحوم کی جتنی خدمت والدہ نے کی، ایسا کم ہی دیکھنے کو ملا۔ میری والدہ محترمہ ترین پٹھان تھیں۔ ذیرہ اسماعیل خان سے ان کا تعلق تھا تاہم میرے بڑے ماموں امین ترین سینئر صحافی تھے، وہ کراچی شفٹ ہو گئے، والدہ کی رخصتی بھی کراچی سے ہوئی، وہ کراچی کو اپنا میکہ سمجھتی تھیں، کراچی مجھے اس وجہ سے بھی عزیز ہے اور ڈی آئی خان بھی۔ میری والدہ کی شادی 1968ء میں ہوئی، اس وقت بھٹو صاحب وزیر خارجہ تھے، وہ خود تو اس شادی میں نہیں آسکے تھے لیکن اس شادی میں بیگم نصرت بھٹو نے شرکت کی تھی۔ خاکوانیوں اور ترینوں میں آپس میں کافی رشتے ہیں۔ میرے نانا ترین تھے، سرائیکی ترین پٹھان خاصی بڑی تعداد میں ہیں، اگرچہ ان کا تعلق پشین کے پشتون ترین قبیلے ہی سے ملتا ہے، تاہم ڈی آئی خان، ملتان، بہاولپور میں سرائیکی ترین ہی آباد ہیں۔ میری والدہ محترمہ سرائیکی بولتی تھیں۔ والدہ صاحبہ بہت عبادت گزار اور نرم مزاج خاتون تھیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ میری ماں ایک مثالی خاتون تھیں۔ وہ نہ صرف ہم بچوں پر سب کچھ نچھاور کر دیتی تھیں بلکہ دیگر لوگوں اور خاندان کا بھی بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں بچپن میں پیاز بالکل نہیں کھاتا تھا اور ہر ایسی چیز جس میں پیاز ہوتا تھا اسے نہیں کھاتا تھا۔ والدہ صاحبہ پورے گھر کے لیے الگ سالن بناتی تھیں اور میرے لیے الگ سالن بناتی تھیں۔ ماں جی بہت زیادہ تو پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ان کا ادبی ذوق خوب تھا۔ انہوں نے پرانے وقتوں میں میٹرک کیا تھا۔ والدہ نے کچھ افسانے بھی لکھے تھے جو ''زیب النساء'' اور ''حور'' نامی پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی تحریر بڑی پختہ اور شگفتہ تھی۔ وہ خواتین کے ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتی تھیں۔ ماں جی کا انتقال 2 جون 2019ء میں ہوا۔ اس عظیم ہستی کے انتقال کے بعد زندگی میں ایک بہت بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنی ماں جی کے بعد بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔ شور تکلیف دیتا ہے، خاموشی سے ڈر لگتا ہے، بال الجھے رہتے ہیں اور ہر لمحہ اداسی کی کیفیت رہتی ہے۔ بس میرے پاس الفاظ نہیں کہ اپنی ماں جی کی شخصیت کا صحیح معنوں میں احاطہ کر سکوں۔

میرے ماموں امین ترین

میرے ماموں امین ترین انگریزی زبان کے سینئر صحافی تھے۔ ان کی وفات پر روزنامہ نوائے وقت نے ایڈیٹوریل نوٹ لکھا تھا۔ 1937ء میں علامہ اقبال کی ہدایت پر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بنی تو اس کے سیکرٹری میرے ماموں تھے، حمید نظامی اس کے صدر تھے، مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس میں شامل تھے۔ تحریک پاکستان میں جب اسلامیہ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مذہبی سیاسی جماعتیں تضادات کا مجموعہ ہیں
اس لیے یہ نوجوانوں کے لیے کشش
کا باعث نہ بن سکیں

کالج لاہور کے طلبا نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا تو اس میں میرے ماموں بھی شامل تھے۔ ماموں جان پنجاب یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ یہ اس زمانے کے گولڈ میڈلسٹ تھے جب پورے پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں ایک ہی یونیورسٹی تھی۔ اسی زمانے میں ماموں جان کینیڈا چلے گئے، وہاں سے انہوں نے مزید تعلیم حاصل کی اور پلاننگ کمیشن پاکستان میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جلد ہی انہوں نے یہ جاب چھوڑ دی اور کراچی میں صحافت کا آغاز کیا۔ وہ بنیادی طور پر انگریزی زبان کے صحافی تھے۔ انہوں نے 1958ء میں پاکستان میں انگریزی زبان کا منفرد اخبار روزنامہ "بینک انشورنس نیوز" جاری کیا۔ پھر اردو ڈائجسٹ طرز کا ایک پرچہ "پاکستان ڈائجسٹ" نکالا۔ یہ ڈائجسٹ بھی انگریزی زبان میں تھا۔ پاکستان پوسٹ اخبار جاری کیا، اس کے بعد انہوں نے انگلینڈ سے ایک اخبار "ایشیا نیوز" نکالا۔ امین ترین کا ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ساتھ اچھا تعلق تھا۔ انہیں بعد میں تحریک پاکستان ورکرز کی طرف سے گولڈ میڈل بھی دیا گیا تھا۔ یہ گولڈ میڈل میں نے ہی وصول کیا۔ پیپلز پارٹی کے شیخ رفیق احمد نے مجھے بتایا تھا کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے جس انداز سے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا وہ سب کچھ میرے سامنے ہے۔ شیخ صاحب نے میرے ماموں کا بھی ذکر کیا اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تحریک پاکستان میں ان کی جدوجہد کا خود مشاہدہ کیا تھا۔

بڑے بھائی طاہر ہاشم خاکوانی

میرے بڑے بھائی طاہر ہاشم خاکوانی نے بھی وکالت کی، مگر پھر پچھلے چند برسوں سے وہ ملوں کی ایڈمنسٹریشن سے منسلک ہوگئے ہیں۔ ان میں جلال والد مرحوم والا ہے، مجھے اکثر طعنہ دیتے کہ تم میں پٹھانوں والی بات نہیں، پڑھ لکھ کر خراب ہوگئے ہو۔ بھائی سیاسی اعتبار سے پکے مسلم لیگی ہیں، زمانہ طالب علمی میں ایم ایس ایف کا حصہ رہے، اب شریف برادران کے اسیر ہیں۔ انہیں یہی شکوہ رہتا ہے کہ تم اپنے کالموں میں عمران خان کے لتے کیوں نہیں لیتے اور مسلم لیگی حکومت کے "عظیم الشان کارنامے" تمہیں نظر نہیں آتے۔ میں جواب میں یہی عرض کرتا ہوں کہ آپ کی عینک سے نہیں دیکھتا، اس لئے مجھے وہ کارنامے نظر نہیں آتے۔ جب وہ گھر آئیں تو ہماری گھنٹوں دھواں دھار بحث ہوتی ہے۔ موضوع دو ہی ہوتے ہیں: سیاست یا پھر کرکٹ۔ کرکٹ میں تو خیر اتفاق رائے رہتا ہے، مگر سیاست میں ہم متضاد موقف کے حامی ہیں۔ دو خاکوانی (چاہئے مجھے نیم خاکوانی تصور کرلیں) جب بحث کریں تو کیسا شور ہو گا، اس کا اندازہ خاکوانیوں کو جاننے والا ہی کرسکتا ہے۔ اس کے باوجود کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ بھائی کو زندگی، صحت کے ساتھ قائم رکھے، وہ میرے والد کی جگہ پر ہیں۔ میری دو بڑی بہنیں ہیں۔ کالم وہ بھی

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

کبھار ہی پڑھ پاتی ہیں، لیکن زبانی کلامی حوصلہ افزائی کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں۔ میرا ایک بھانجا محمد علی خاکوانی حال ہی میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بنا ہے۔ وہ سی ایس ایس کی تیاری کے سلسلہ میں چار سال میرے پاس لاہور رہا۔ اسے یہاں پر رہ کر کالم پڑھنے کی عادت پڑ گئی، اب وہ کبھی کبھار کسی کالم کو پڑھ کر فون کرتا اور داد دیتا ہے۔ میرے ایک دو کالموں میں اس کے دوستوں کے حوالے سے بعض واقعات آ گئے تھے، وہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ اس وقت تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ نے میرے ان دوستوں کو اتنے غور سے دیکھا یا ان کی باتیں سنی تھیں۔

میں نیواں میرا مرشد اُچا

جب یہ اخبار نویس 1996ء میں قلم کا تیشہ کاندھے پر رکھے شہر لاہور میں وارد ہوا۔ اسے خوش قسمتی ہی کہیے کہ آتے ہی ایک قومی جریدے ''اردو ڈائجسٹ'' میں ملازمت مل گئی بلکہ ملازمت کا عندیہ لاہور آنے سے پہلے ہی دیا جا چکا تھا۔ ایک قریبی دوست کے ساتھ رہائش کا معاملہ بھی طے پا گیا۔ ایک دو ماہ تک جب معاملات بہتر ہونے لگے تو سوچا صوفیوں کے شہر میں ہوں اور کسی بابے کو تلاش کرنا چاہیے جہاں سے کچھ فیض حاصل کیا جا سکے۔ انہی دنوں ممتاز مفتی کی کتاب ''الکھ نگری'' پڑھی تھی جس کا انتساب لاہور کے ایک صوفی سرفراز شاہ صاحب کے نام تھا۔ ان کی تلاش شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ 212 سی، جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں اور جمعہ کے روز ان کی محفل سجتی ہے۔ اگلے جمعے ان کے ہاں جا پہنچا، کچھ ہی دیر انتظار کے بعد میری باری بھی آ گئی۔ شاہ صاحب کے قریب جا کر بیٹھا تو انہیں ایک نظر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سادہ شخصیت، کلین شیو، چہرے سے متانت اور سنجیدگی مترشح تھی، روایتی پیروں والا ان کا کوئی حلیہ نہ تھا۔ وضع قطع سادہ اور گفتگو شائستہ اور متین تھی۔ میں نے اپنے صحافتی کیریئر کے متعلق دعا کا کہا تو انتہائی مختصر جواب دیا کہ اللہ خیر کرے گا۔ اس کے بعد قریب پڑی ''نانی'' اٹھا کر دے دی، ہم نے وہ نانی منہ میں رکھی اور حیران ہو کر لوٹ آئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا یہی طریقہ ہے۔ کسی سے لیتے دیتے کچھ بھی نہیں، جو آتا ہے اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تعویز دیتے ہیں اور نہ کوئی وظیفہ بتاتے ہیں۔ محسوس ہوا کہ انہیں پیر بننے اور پیر کہلانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بیعت لیتے ہیں اور نہ مرید بناتے ہیں بلکہ الٹا لوگوں کو پیروں سے ''گمراہ'' کرتے ہیں، کہتے ہیں اللہ پر بھروسہ کرو، اس کی رضا پر راضی رہو، پیروں کے پاس دعا کے لئے جانے کا کیا فائدہ۔ روحانیت پر ان کی سات کتابیں ہیں فقیر، فقیر رنگ، فقیر نگری، لوح فقیر، نوائے فقیر، ارژنگ فقیر اور عرش فقیر شائع ہو چکی ہیں۔

سید سرفراز شاہ صاحب میرے روحانی والد اور مرشد ہیں۔ میری زندگی پر ان کے اثرات بے پناہ ہیں۔ شاہ صاحب اگر نہ ہوتے تو شاید صحافت اور کالم نویسی کے اس سفر میں کب کا ڈگمگا کر گر پڑتا۔ وہ اللہ والے ہیں، ان کی توجہ، محبت اور رہنمائی میرے ساتھ ہمیشہ رہی۔ جب چاروں اطراف سے تاریکیوں نے میرے اوپر یلغار کی، شاہ صاحب کی ذات کسی لائٹ ہاؤس کی مانند میرے سامنے موجود رہی، ان کی شخصیت سے پھوٹنے والی امید کی کرنوں نے گھنا ٹوپ اندھیرے چاک کر ڈالے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نیکی کا اجر ملا کہ شاہ صاحب کی صحبت نصیب ہوئی، یہ یقیناً میری والدہ کی دعائیں ہوں گی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جنرل ضیاالحق نے پاکستان کو فائدہ پہنچایا مگر

نقصان زیادہ، جنرل مشرف پاکستانی تاریخ

کے بدترین ڈکٹیٹر تھے

جو قبول ہوئیں اور رب تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں میں سے ایک کو میرے جیسے گناہ گار شخص کی رہنمائی، مدد کے لئے مقرر کر دیا۔ میں سرفراز شاہ صاحب کا ازحد شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ زندگی صحت کے ساتھ ان کا سایہ میرے جیسے لوگوں پر قائم رکھے، آمین۔

میں نیواں میرا مرشد اُچا، اساں اُچیاں نال لگائی
صدقے تینوں اُنہاں اچیاں تے جنہاں نیویاں نال نبھائی

بچپن کی کچھ یادیں

میرا بچپن احمد پور شرقیہ کے گلی کوچوں ہی میں گزرا۔ میں شرارتی بچہ نہیں تھا بلکہ بہت ہی شریف تھا اور والدین کی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کر دینے والا تھا۔ والد صاحب ہماری پڑھائی اور تربیت کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ ان کا حکم تھا کہ مغرب کے بعد گھر سے باہر ہرگز نہیں نکلنا۔ آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کو بہت ناپسند کرتے۔ ایک مرتبہ میں لڑکوں کے ساتھ نہر پر نہانے کے لیے چلا گیا تو واپسی پر والد صاحب نے میری پٹائی کر دی تو اس کے بعد میں نہر پر کبھی نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر نہر پر نہانے کے بعد مار ہی کھانی ہے تو اس سے بہتر ہے کہ بندہ گھر پر ہی نہا لے۔ ہمارے گھر میں پیسے کی بہت زیادہ ریل پیل اور خوشحالی تو نہیں تھی لیکن اللہ کے فضل وکرم سے تنگی بھی کسی قسم کی نہ تھی۔ والدین نے ہماری ہر ضرورت پوری کی۔ ہمیں اچھا کھلایا پلایا اور پہنایا اور اچھی تربیت کی۔ ہمارے گھر میں ریڈیو، ٹی وی کچھ بھی نہیں تھا۔ والد صاحب ان کے سخت خلاف تھے، وہ کہتے تھے اس سے وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ شاید اس لیے ہم پڑھ بھی گئے اور واقعی ہمارا وقت ضائع نہ ہوا۔

والد صاحب کا اچھا بھلا کتب خانہ تھا اور ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے ان سے کوئی بات پوچھی ہو اور انہیں اس کے متعلق معلومات نہ ہوں۔ گریجوایشن کی سطح کا میں نے انگریزی زبان کا جو بھی جملہ یا لفظ ان سے پوچھا انہوں نے مجھے فوری طور پر سمجھا دیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ سکول کے دنوں میں جب مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت زیادہ شوق ہوا تو ان دنوں میں والد صاحب کے ساتھ بریلوی دیوبندی بحث بہت کیا کرتا تھا۔ ان دنوں ہمارے علاقے کی فضا بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس وقت ہمارے علاقے میں ان دونوں مکاتب فکر کے مابین بڑے مناظرے ہوا کرتے تھے اور مجھے بھی شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوتے تھے جن پر "مولانا منظور بھٹی کی للکار اور شمشاد سلفی کا فرار" جیسی عبارتیں درج ہوتی تھیں۔ اسی طرح مولانا عبد الستار تونسوی صاحب کے مناظرے بھی عروج پر تھے۔ ایک مرتبہ میں نے والد صاحب کے ساتھ اس بات پر بڑی طویل بحث کی کہ جنازے کے بعد دعا نہیں مانگنی چاہیے اور یہ بدعت ہے۔ والد صاحب کا نقطہ نظر تھا کہ مرحوم کے لیے جتنی بھی دعا مانگی جائے اتنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ بحث

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

زیادہ بڑھ گئی تو والد صاحب نے گھر والوں سے کہا کہ میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ آپ نے میری نماز جنازہ کے بعد میرے لیے ضرور دعا کروانی ہے۔ انہوں نے قریب بیٹھے میرے بڑے بھائی سے کہا کہ تم لوگوں نے عامر کی بات نہیں ماننی اور میرے لیے دعا کروانی ہے۔ ویسے والد صاحب میں فرقہ واریت بالکل بھی نہیں تھی۔ ان کی بہت بڑی لائبریری تھی جس میں ہر مسلک اور ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ میں نے ان کی لائبریری سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ ان کی لائبریری ہی سے میں نے شورش کاشمیری کے جریدے چٹان اور سید قاسم محمود کے شاہکار انسائیکلو پیڈیا کی فائلیں پڑھیں۔ والد مرحوم صوفی منش تھے، ان میں فرقوں کے حوالے سے تعصب بالکل نہیں تھا۔ یہی تلقین کرتے کہ بطور مسلمان شناخت بناؤ، بریلوی، دیوبندی کے چکر میں نہ پڑو۔ والد صاحب ہمیں کہا کرتے تھے کہ کسی بھی مسلک کو اپنے اوپر بوجھ نہ بناؤ۔ بس اپنی شناخت مسلمان کے طور پر بناؤ اور مسالک کے فروعی اختلافات میں مت الجھو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ چلیں زیادہ سے زیادہ اتنا کر لیجیے کہ مسلمانوں میں ایک بنیادی تقسیم اہل سنت اور اہل تشیع کی ہے اس کے علاوہ کوئی تقسیم نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ بھی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں کی فقہ ہی مختلف ہے۔

میرا تعلیمی سلسلہ

میں نے گورنمنٹ صادق عباسی ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور صادق ڈگری کالج سے ایف ایس سی اور ڈبل میتھ، فزکس کے ساتھ گریجوایشن کی اس کے بعد کراچی اپنے ماموں کے پاس چلا گیا اور جامعہ کراچی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ میرے ماموں مستقل طور پر کراچی میں رہتے تھے اور یہ شہر میرا ایک طرح سے ننھیالی شہر بنا ہوا تھا۔ میں نے جامعہ کراچی میں داخلہ لیا تو وہاں کے حالات بہت خراب تھے، امن و امان کی صورتحال بہت دگرگوں تھی۔ یونیورسٹی میں اکثر ہنگامے ہوتے، گولیاں چلتی تھیں اور لڑکے قتل ہوتے تھے۔ یہ 1992ء میں مہاجر طلبہ تنظیم پی ایم ایس او کا بدترین دور تھا۔ اس وقت کراچی میں زبردست فوجی آپریشن ہوا اور اس کے بعد ہی کچھ سکون ہوا۔ کراچی میں مختلف لائبریریوں میں جاتا تھا اور کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ 1994ء میں نے ایل ایل بی کیا۔ لاء کرنے کے بعد میں واپس آیا تو پھر والد صاحب کے پاس بھی لاء ہی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ والد صاحب لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیل تھے۔ میں نے کچھ سینئر وکلاء کے ساتھ اپرنٹس شپ بھی کی۔ 1996ء میں مجھے اردو ڈائجسٹ لاہور میں الطاف حسن قریشی صاحب کے ہاں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی، تب سے اب تک صحافت ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔

اپنے سکول کے اساتذہ کا ذکر خیر کروں تو ان میں ایک استاد رضاء اللہ خان صاحب تھے، بڑے محنتی اور اچھے انسان تھے۔ یہ مارتے بالکل بھی نہیں تھے اور ان کے پڑھانے کا انداز بہت اچھا تھا۔ وہ جو بھی مضمون پڑھاتے اس کی ٹیوشن کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ ایک استاد احمد شاہ صاحب تھے، میں ان سے ساتویں اور آٹھویں میں پڑھتا رہا، انہوں نے ہماری انگریزی زبان بہت مضبوط کی۔ نصر اللہ خان اور راشد صاحب بھی اچھے اساتذہ تھے، ایک خدا بخش عارف تھے۔ میں پڑھائی کے معاملے میں اچھا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہم میاں نواز شریف، شہباز شریف کو تو قبول کر سکتے تھے، ان کی اگلی نسل کو شہزادوں کی طرح مسلط ہوتے دیکھنا کربناک تھا

سٹوڈنٹ تھا۔ ٹاپ کرنے والا تو نہیں، مگر اوسط سے اوپر ہی تھا، تھرڈ ائیر میں سیکنڈ پوزیشن بھی لی، جس میں کالج کی طرف سے انعام بھی ملا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا حنیف ندوی کی کتاب افکار ابن خلدون تھی۔ میرا پسندیدہ مضمون تو کوئی خاص نہیں تھا کیونکہ میں نے اپنے آپ کو بہت بعد میں ''ڈسکور'' کیا۔ یعنی میری اردو میں دلچسپی ہونی چاہیے تھے لیکن یہ چیز طالب علمی کے زمانے میں سامنے نہ آسکی۔ میٹرک میں میرے سب سے زیادہ نمبر اردو مضمون میں تھے۔ میں فرسٹ ڈویژن لینے والا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کر لینا بہت بڑی بات سمجھی جاتی۔ ریاضی اور سائنس کے مضامین بھی میں نے بہت شوق سے پڑھے۔

میں کالج کے زمانے میں طلبہ سیاست میں فعال تو نہیں تھا، مگر ان دنوں طلبہ یونین کے الیکشن ہوئے، یہ بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی حکومت میں کرائے تھے، میں نے یونین انتخابات میں ایم ایس ایف کو سپورٹ کیا تھا حالانکہ اس کے مقابلے میں سرائیکی سٹوڈنٹس فیڈریشن تھی۔ میں اپنے آپ کو مسلم پاکستانی نیشنلسٹ کہتا ہوں، کسی حد تک سرائیکی قوم پرست بھی مگر مثبت انداز میں۔ اپنی دھرتی اور اپنی ماں بولی کے ساتھ مجھے بہت محبت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کسی دوسری زبان یا نسل سے نفرت کرتا ہوں۔ میں زمانہ طالب علمی میں نواز شریف کو بہت پسند کرتا تھا۔ دلچسپ بات دیکھیں کہ میرے والد صاحب اینٹی پیپلز پارٹی تھے لیکن میری والدہ کی شادی میں بیگم نصرت بھٹو نے شرکت کی تھی۔ میرے والد صاحب میں وسعت نظری بہت تھی۔ 1977ء کے انتخابات میں والد اور پورا خاندان پی این اے کا حامی جبکہ والدہ پیپلز پارٹی کی جانب سے پولنگ ایجنٹ تھیں۔ والدہ پیپلز پارٹی کی حامی تھیں اور والد صاحب مسلم لیگ کے لیکن گھر میں اس حوالے سے کبھی ناخوشگواری پیش نہ آئی تھی۔ جب بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی اور روزنامہ وفاق میں سپر لیڈ لگی تو اس دن میری والدہ سارا دن روتی رہیں اور ہمارے گھر کھانا نہ پک سکا۔ والد بھی والدہ کے احترام میں خاموش ہی رہے۔ کوئی ایسا تبصرہ نہ کیا جو دل آزاری کا باعث بنے۔ یہ چیزیں میں نے لاشعوری طور پر اپنے گھر سے سیکھیں اور بعد میں اپنی عملی زندگی میں، اپنے گھریلو رشتوں میں اپنائی، الحمدللہ۔

''تلمیذ الرحمٰن''

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ میرے اساتذہ بہت اچھے تھے، محنت کرنے والے تھے لیکن جہاں تک میرے ادبی اور صحافتی ذوق کا تعلق ہے اس میں براہ راست کسی استاد کا کردار نہیں تھا۔ بس صحافت اور اردو ادب کے متعلق میرا معاملہ ''تلمیذ الرحمٰن'' والا ہے۔ لاہور عملی صحافت شروع کرنے کے بعد کئی ساتھی صحافیوں نے پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں ماسٹر کیا، ڈیپارٹمنٹ والے حاضری کے معاملے میں رعایت بھی دے دیتے تھے، مگر میں نے داخلہ نہیں

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

لیا۔ کبھی یہ کہا تو نہیں، مگر آج مان رہا ہوں کہ لاشعور میں کہیں یہ خیال دامن گیر تھا کہ کل کو ماس کام کا کوئی استاد کہہ دے گا کہ یہ خاکوانی میرا شاگرد ہے۔ شاگرد ہونا کوئی بری بات نہیں مگر اصل شاگرد فکری طور پر ہوتا ہے یا جس کی تربیت کی جائے، کسی تعلیمی ادارے میں معمول کی ڈگری لے لینے سے حقیقی معنوں میں کوئی شاگرد نہیں بن جاتا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میری ادبی، علمی اور صحافتی زندگی میں ''سب رنگ ڈائجسٹ'' کا کلیدی کردار رہا ہے۔ میں نے سب رنگ بہت زیادہ پڑھا ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس نے کئی نسلوں کی علمی اور ادبی تربیت کی ہے۔ میری مطالعاتی زندگی میں سب رنگ ڈائجسٹ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کے لیجنڈری مدیر شکیل عادل زادہ کا میں بہت زیادہ مداح ہوں اور ان کا ممنون بھی ہوں۔ سب رنگ ڈائجسٹ نے اپنے قارئین میں ادبی ذوق پیدا کیا اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب سے بھی انہیں متعارف کرایا۔ پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی صاحب کو وہیں پہلے پڑھا۔ اسد محمد خان، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، انتظار حسین سے لے کر کئی بہت عمدہ مگر نسبتاً غیر معروف لکھاریوں جیسے قاضی عبدالستار، ابوالفضل صدیقی، سید رفیق حسین، آغا اشرف، جیلانی بانو اور غیاث احمد گدی وغیرہ سے بھی تعارف ہوا۔ شوکت صدیقی کا شہرہ آفاق ناول جانگلوس وہیں پڑھا۔ شکیل عادل زادہ کے ناول ''بازی گر'' نے میرے اوپر سب سے گہرا اثر ڈالا۔ اس طلسماتی ناول کو درجن سے زیادہ بار پڑھ چکا ہوں، جی نہیں بھرا۔

صحافت کی وادی خارزار

زمانہ طالب علمی ہی سے میرا خیال تھا کہ وکالت کرنا ہے یا پھر صحافت۔ میں نے اردو ڈائجسٹ میں 6 فروری 1996ء میں بطور سب ایڈیٹر صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ساڑھے تین سال کے بعد روزنامہ جنگ جوائن کرلیا۔ جنگ میں تین سال کام کرنے کے بعد یکم جون 2002ء میں روزنامہ ایکسپریس جوائن کرلیا۔ میں ایکسپریس کے میگزین صفحات کا بانی ایڈیٹر تھا۔ روزنامہ ایکسپریس ہی میں مَیں نے فروری 2004ء کے اوائل میں ''زنگار'' کے عنوان سے مستقل کالم لکھنا شروع کیا۔ دس سال ایکسپریس میں کام کرنے کے بعد اگست 2012ء میں بطور میگزین ایڈیٹر، کالم نگار روزنامہ دنیا کی بانی ٹیم کا حصہ بنا۔ دنیا اخبار ہی میں میں نے ڈائجسٹ ایڈیشن شروع کیا جس کی پیروی بعد میں بہت سے اخبارات نے کی۔ پونے پانچ سال کے لگ بھگ دنیا اخبار میں کام کرنے کے بعد جنوری 2017ء میں روزنامہ 92 نیوز کی بانی ٹیم میں شامل ہوا۔ اب گزشتہ تین سال سے اسی اخبار میں بطور میگزین ایڈیٹر، کالم نگار کام کر رہا ہوں۔ دلچسپ بات ہے کہ میگزین ایڈیٹر ہونا میری مرکزی ملازمت ہے، مگر شناخت بطور کالم نویس ہی ملی۔ مجھے آج تک کبھی کسی نے میگزین ایڈیٹر کی بنیاد پر دعوت نامہ نہیں بھیجا یا ملنے کی خواہش نہیں کی۔ جو ریڈرشپ یا کسی حد تک فین شپ ہے، وہ کالموں کی وجہ سے ہے۔ اللہ نے کالم ہی عزت کا باعث بنائے، اگرچہ میرا یہ خیال ہے کہ بطور میگزین ایڈیٹر میری کارکردگی بری نہیں رہی، بلکہ بعض کے نزدیک تو بہت اچھی رہی۔

میں نے اپنے کالموں میں کئی نئے تجربات کیے اور اردو کالم کے کینوس کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرنٹ افیرز پر بھی کالم لکھے لیکن خود کو محدود نہ کیا اور بہت سے دیگر موضوعات پر بھی لکھا۔ ان کالموں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں تحریک انصاف کے "پسندیدہ" صحافیوں میں شامل نہیں، کبھی کسی تقریب میں بلایا نہ مجھے خواہش پیدا ہوئی

کی تازگی آج بھی برقرار ہے۔ میں نے ادب، تاریخ، تصوف، روحانیت، سیاست اور سماجی اشوز سے لے کر سپورٹس اور موٹیویشنل موضوعات پر بہت لکھا۔ ان کالموں کا انتخاب تین سال پیشتر "زنگار" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ عسکریت پسندی، طالبانائزیشن اور اسلامی و جہادی تحریکیں بھی میرے پسندیدہ موضوع ہیں۔ ان موضوعات پر میری کتاب زیر طبع ہے۔ میرے کالموں کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ "زنگار نامہ" کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں گزشتہ آٹھ برسوں میں شائع ہونے والے صرف وہی کالم منتخب کیے گئے جن کی تازگی آج بھی برقرار ہے۔ یہ کالموں کا مجموعہ نہیں بلکہ بے رحم انتخاب ہے اور 900 سے زائد کالموں میں سے منتخب کئے گئے صرف 90 کالم ہیں۔ مجھے کتابوں سے بے حد محبت ہے۔ ارادہ ہے کہ اپنی پسندیدہ کتابوں پر الگ سے کتاب لکھوں۔

پہلا کالم 1993ء میں جنگ میں چھپا

میرا پہلا کالم 1993ء میں شائع ہوا تھا۔ کالم لکھنے کی خواہش مگر اس سے بھی پرانی تھی۔ 1980ء کے عشرے سے ارشاد احمد حقانی جیسے لکھاریوں کے کالم پڑھتے پڑھتے لگتا کہ شاید اپنے ذہن میں میں خود بھی کالم لکھ رہا ہوں۔ مجھے 27 سال پہلے، کراچی کی وہ بھیگی صبح یاد آتی ہے جب میں اپنا پہلا کالم لے کر روزنامہ "جنگ" کے دفتر گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آئی آئی اے کی بس میں بیٹھ کر ناظم آباد سے گزرتا میں آئی آئی چندریگر روڈ جنگ کے دفتر پہنچا۔ ہاتھ میں کالم کا لفافہ تھا۔ ریسپشن والے نے ادارتی سیکشن سے کسی کو بلانے سے صاف انکار کر دیا اور بولا کہ جو کچھ دینا ہے، ادھر ہی جمع کرا دیں۔ کالم جمع کرا کر میں واپس اپنے ماموں کے گھر آ گیا۔ اگلے روز صبح صبح اٹھ کر باہر گیراج میں گیا، جہاں جا کر جنگ اور ڈان اخبار پھینک کر جاتا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اخبار کھولا اور پھر وہ منظر، وہ لمحہ..... دل میں گویا نقش ہو کر رہ گیا۔ میرا کالم "نرائیکا کی آئینی و سیاسی حیثیت" جنگ کے ادارتی صفحے کے اپر ہاف پر ارشاد احمد حقانی صاحب کے کالم کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ ناقابل یقین حیرت کے ساتھ میں نے کالم پڑھنا شروع کیا۔ صرف ایک لفظ تبدیل کیا گیا تھا، باقی ویسے ہی چھپا۔ آج بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک طالب علم کا ریسپشن پر دیا گیا کالم جنگ جیسے بڑے اخبار میں کس طرح شائع ہو سکتا ہے، جبکہ وہاں ادارتی سیکشن کے پاس درجنوں کالم شائع ہونے کے انتظار میں رکھے ہوتے ہیں۔ ان دنوں جنگ کے ایڈیٹوریل ارشد امام تھے۔ انہی نے یہ کام کیا تھا۔ ارشد امام صاحب، میں آپ سے کبھی نہیں ملا، آپ کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ میرا پہلا کالم آپ نے شائع کیا۔ یہ طالب علم مگر آپ کا ممنون ہے، رہے گا۔ اگر وہ کالم شائع نہ ہوتا تو شاید میری زندگی کا رخ مختلف ہوتا۔ شاید صحافی کے بجائے، میں قانون دان بن جاتا، جس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں نے 1996ء میں اردو ڈائجسٹ جوائن کیا اور اس میں ساڑھے تین سال کام کرنے کے بعد بطور سب ایڈیٹر (نیوز روم) روزنامہ جنگ جوائن کر لیا۔ جنگ میں تین سال کام کرنے کے بعد 2002ء میں روزنامہ ایکسپریس جوائن کرلیا۔

فروری 2004ء میں روزنامہ ایکسپریس کے اس وقت کے ایڈیٹر (آج کل گروپ ایڈیٹر) ایاز خان نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ آپ اپنا کالم شروع کریں، سلطان لاکھانی سے اپر دول لے لی ہے۔ ان دنوں میں ایکسپریس کے شعبہ میگزین کا انچارج تھا۔ ایاز خان کی اس غیر متوقع بات پر حیرت سے انہیں دیکھ کر میں نے پوچھا کہ کس طرح ایسا ہو گیا؟ ایاز صاحب کا کہنا تھا کہ میگزین میں آپ کی تحریریں پڑھ کر میرا اور عابد عبداللہ (ڈائریکٹر آپریشنز) کا خیال ہے کہ آپ سے کالم لکھوانے چاہئیں۔ ابھی جا کر اپنے کالم کا عنوان سوچیں اور آج یا زیادہ سے زیادہ کل تک پہلا کالم دے دیں۔ اگلے روز سے میرے کالم ''زنگار'' کا آغاز ہوگیا۔ میں ایاز صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ کالم نگار بننے کے میرے خواب کو عملی حقیقت بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایکسپریس کے اس وقت کے ایڈیٹوریل انچارج (آج کل ایڈیٹر ایڈیٹوریل) لطیف چودھری نے بھی کمال خندہ پیشانی سے ہمارے کالموں کو برداشت کیا۔ میں ہمیشہ آخری لمحوں میں لکھتا۔ کاپی فائنل ہونے کا وقت سات بجے ہوتا تو میرا کالم چھ بجے سے پہلے انہیں نہیں پہنچتا تھا۔ اکثر ایسے ہوتا کہ صرف میری وجہ سے ادارتی صفحہ رکا ہوا ہے، لطیف چودھری ہمیشہ دھمکی دیتا رہا کہ کالم روک لوں گا، مگر ہمیشہ اکاموڈیٹ کیا۔ میں ان کا بھی ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

کونسل آف نیشنل افیئرز (سی این اے)

میرا کالم ''زنگار'' شروع ہوئے ایک ہفتہ بیت گیا۔ دو تین کالم شائع ہوگئے۔ خیال آیا کہ اگر ہفتے میں دو تین دن کالم لکھنا ہے تو پھر کوئی تھنکرز فورم جوائن کرنا چاہیے۔ اردو ڈائجسٹ کے زمانے میں اپنے سینئر محسن فارانی صاحب سے سی این اے (کونسل آف نیشنل افیئرز) کے بارے میں سن چکا تھا کہ لاہور کے اس تھنک ٹینک کی ہر جمعہ کو نشست ہوا کرتی ہے، جس میں لاہور کے بہت سے سینئر صحافی، تجزیہ کار، دانشور شریک ہوتے ہیں۔ سینئر صحافی سید ارشاد احمد عارف اس کے کنوینر اور روح رواں ہیں۔ وہ ان دنوں ''نوائے وقت'' کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ ان سے ملنے نوائے وقت جا دھمکا۔ شاہ صاحب اپنی روایتی خوش خلقی سے ملے، چائے پلائی، ازراہ تلطف سی این اے میں شمولیت کی درخواست قبول کی۔ دوران گفتگو ان سے اپنے کالم کے بارے میں پوچھا، مسکرا کر کہنے لگے، میں نے پڑھے ہیں۔ پوچھا کہ آپ کو کیسے لگے؟ چند لمحوں کے توقف کے بعد ارشاد عارف صاحب نے کہا، ''میرے خیال میں پچاس سال سے پہلے کالم نہیں لکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے آدمی ''یک رخا'' سوچتا اور لکھتا ہے۔ کالم کے لئے ضروری ہے کہ لکھنے والا متوازن سوچ رکھتا ہو اور جامع انداز میں لکھے۔'' یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند کان میں اتر گئے۔ مجھے یقین ہے کہ چہرہ سرخ ہوگیا ہوگا، غصے اور جذبات کی ایک شدید لہر اٹھی، بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر مگر کسی قدر گستاخانہ لہجے میں میں نے کہا، جناب دو باتیں ہیں، پہلی یہ کہ میرے جیسے بے شمار نوجوانوں کو محسوس ہوتا ہے کہ کالم نگار ہمارے لئے نہیں لکھ رہے۔ اس لئے میں اپنے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جماعت اسلامی کا مضبوط پہلو اصلاحات کا حامی ہونا ہے، مگر وہاں نئے خیالات کی کوئی جگہ نہیں، یہی ناکامی کی وجہ ہے

جیسے لوگوں کی آواز بلند کرنے کے لئے کالم نگاری کی طرف آیا ہوں۔ دوسرا ہم نے صحافت میں ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو ساٹھ، ستر سال کے ہو چکے ہیں، مگر نہایت یک رخی سوچ رکھتے اور اسی انداز میں لکھتے ہیں۔ یہ کہہ کر اٹھ آیا۔ غصہ مگر بہت آیا تھا۔ واپسی پر موٹر سائیکل چلاتے بارہا یہ خیال آیا کہ یہ پرانے کالم نگار ہم جیسے نوجوانوں کو کالم لکھتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے، انہیں خود تو سفید بال ہونے پر موقعہ ملا، ہمیں بھی بوڑھا کر کے قلم پکڑانا چاہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ واقعہ برسوں میرے ذہن میں چبھتا رہا، آج تک ذہن کے نہاں خانوں میں تمام تر جزیات کے ساتھ محفوظ ہے۔ دو فائدے مگر اس کے ہوئے، جس کا اس وقت اندازہ نہیں تھا۔ جب کالم لکھنے بیٹھتا ہوں، ایک ترازو سا نظروں کے سامنے آ جاتا ہے، لکھتے ہوئے یہی احساس رہتا ہے کہ یک رخا نہ ہو جائے، تمام تر پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے جامع رائے دی جائے اور ہر ممکن طور سے توازن برقرار رکھا جائے۔ شاہ صاحب (ارشاد احمد عارف) سے سی این اے میں بہت سیکھا، انہوں نے ہمیشہ بڑی محبت، شفقت اور سلیقے سے سمجھایا، سکھایا، کبھی اپنے سینئر، بڑے ہونے کا احساس نہ ہونے دیا۔ اب جا کر سمجھ آئی ہے کہ جہاندیدہ صحافی نے ایک نوجوان پرجوش نئے کالم نگار کی حوصلہ شکنی نہیں کی، بلکہ بڑی بنیادی بات یوں سمجھائی کہ تاعمر وہ ساتھ چلے۔ آج بہت سے پڑھنے والے یہ پوچھتے ہیں کہ آپ اتنے توازن اور اعتدال سے کالم کیسے لکھ لیتے ہیں؟ ہارون الرشید صاحب نے ایک بار کہا، خاکوانی، لگتا ہے آپ ترازو ہاتھ میں رکھ کر کالم لکھتے ہیں۔ وجہ آج بیان کر دی۔ شکریہ ارشاد عارف صاحب، سی این اے کی محفلوں میں آپ سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص کر دوسروں کی طویل تقریریں تحمل سے سننا اور مخالفانہ تنقید کو برداشت کرتے ہوئے شائستگی سے اپنا نقطہ نظر بیان کرنا آپ پر ختم ہے۔ ذاتی انکسار اور جونیئرز کی حوصلہ افزائی بھی ارشاد عارف صاحب میں کمال حد تک موجود ہے۔ سی این اے کی محفلوں میں گاہے حیرت بھی ہوتی تھی کہ اس قدر آؤٹ آف دا وے جا کر کسی نوجوان کی بے سروپا گفتگو سنی اور اس پر حوصلہ افزا مسکراہٹ نچھاور کی جا سکتی ہے، یہ شاہ صاحب کا خاصہ ہے۔

کالم کا مستقل عنوان

میرے کالم کا مستقل عنوان ''زنگار'' ہے۔ بہت لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ نام کیسے رکھا، کس نے تجویز کیا۔ یہ مشورہ غلام محی الدین کا تھا، میرے جنگ کے زمانے کے دوست اور ایکسپریس کے موجودہ میگزین انچارج غلام محی الدین۔ غلام محی الدین اور میں نے روزنامہ جنگ ایک ہی دن جوائن کیا تھا۔ یہ تعلق دوستی کے رشتے میں بدل گیا۔ ایکسپریس میگزین گیا تو جواد نظیر صاحب جو بانی ایڈیٹر تھے، ان سے محی الدین کو لانے کا بھی کہا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یوں غلام محی الدین ہمارے ساتھ ایکسپریس میگزین میں آ گئے۔ محی الدین ایک صاحب علم اور نہایت ذہین صحافی ہے، جس نے اپنے اوپر ایک ست الوجود، کاہل اور موٹی کھال والے شخص کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس کے کرخت چہرے اور گھورتی ہوئی چھوٹی درشت آنکھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص سونے کا دل کا مالک ہے۔ جو دوستوں پر لاکھوں لٹا دے اور پھر زندگی بھر مڑ کر دیکھے، نہ کبھی حوالہ دے۔ میں کبھی کالم نہ لکھ سکتا، اگر محی الدین جیسا دوست میسر نہ ہوتا۔ جس نے میگزین میں ایسا ٹینشن فری ماحول بنایا کہ یکسو ہو کر کام کر سکا۔ ہر کڑے وقت میں وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا رہا۔ ہر مشکل لمحے کو اپنی حوصلہ افزائی، فلک شگاف قہقہے اور زندہ جاوید مسکراہٹ سے آسان بنا دیتا۔ کالم کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو غلام محی الدین نے ''زنگار'' کا مشورہ دیا۔ ایکسپریس کے ایڈیٹر ایڈیٹوریل لطیف چودھری کے کالم کا عنوان سمت نما بھی محی الدین ہی نے تجویز کیا تھا۔ زنگار کی اصطلاح غالب کے ایک شعر سے لی گئی۔ شعر مجھے یاد نہیں رہتے، بڑی مشکل سے یہ یاد کیا۔ امید ہے کہ درست لکھا جائے گا۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

زنگار دراصل وہ مادہ ہے جو شیشے کے پیچھے مل دیا جائے تو وہ آئینہ بن جاتا ہے۔ یعنی زنگار ''ویو'' دکھاتا ہے، اس کے بغیر آپ آئینہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اصطلاح مجھے پسند آئی، کالم کا عنوان رکھ لیا۔ پچھلے برسوں میں سینکڑوں لوگوں نے اس کا مطلب پوچھا ہے۔ عام لغت میں بھی یہ لفظ نہیں۔ درجنوں جلدوں پر محیط لغت کبیر دیکھنی پڑتی ہے اس کے لئے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ شرمندگی سے پوچھتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ پھر انہیں یہی شعر سنانا پڑتا ہے، کوئی سند پوچھ لے تو پھر یہی شعر سنا کر چپ کرانا پڑتا ہے۔

میں نے غیر سیاسی موضوعات پر لکھنا شروع کیا

روزنامہ ایکسپریس میں عباس اطہر صاحب کے بطور گروپ ایڈیٹر آنے سے پہلے میں ہفتہ میں دو تین کالم لکھا کرتا تھا، مگر ناغے ہو جاتے۔ شاہ صاحب نے پہلے تو میرا کالم بند کر دیا۔

عباس اطہر (شاہ جی) روایتی دھڑے بندی والے آدمی تھے، وہ ایکسپریس میں نئے نئے آئے، ان کے ساتھ عبداللہ طارق سہیل بطور ایڈیٹر تھے، شاہ جی توصیف احمد خان کے سخت مخالف تھے، ادھر ایکسپریس کے ان سے پہلے موجود ایڈیٹر ایاز خان اتفاق سے توصیف احمد خان کے دوست تھے، سو شاہ جی نے ایاز خان کو اپنی ہٹ لسٹ پر رکھ لیا۔ وہ برملا کہتے کہ میرے دشمن کا دوست میرا بھی دشمن ہے۔ اب میں چونکہ پہلے سے میگزین انچارج اور کالم لکھ رہا تھا اس لیے شاہ جی کا خیال تھا کہ اسے ایاز خان نے رکھا ہے تو یہ اس کے گروپ کا بندہ ہے۔ حالانکہ میرے جیسا شخص کبھی گروپنگ کا حصہ نہیں بنتا، مجھے دفتری سیاست سے ویسے ہی چڑ ہے۔ میں شاہ جی کی خواہ مخواہ کی مخالفت کا نشانہ بنا۔ انہوں نے میرا ایک کالم روک دیا اور طنزاً کہا، جیسا کہ اس زمانے میں پرانے صحافیوں کا طریقہ تھا کہ جس کالم کو مردود قرار دینا ہو، اسے کہتے کہ یہ کالم نہیں جواب مضمون (Essay) ہے۔ میرا کالم بھی شاہ جی نے جواب مضمون کہہ کر بند کر دیا۔

میں بڑا دلبرداشتہ ہوا سرفراز شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، دعا کی درخواست کی۔ سرفراز

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کسی سیاسی پارٹی کی طرف جھکاؤ نہیں،

تحریک انصاف کو ایک سیاسی آپشن ہی سمجھا،

بے رحم احتساب کا حامی ہوں

شاہ مسکرائے اور بولے کہ فکر نہ کریں۔ کچھ ہی دنوں میں یہی صاحب آپ سے ہفتے میں تین کالم لکھنے کا کہیں گے۔ پھر وہی ہوا، عباس اطہر صاحب نے مجھے بلا کر کہا، آپ کے انداز میں کہانی کا عنصر شامل ہے، اسی سٹائل میں کالم لکھتے رہو، چار دن جاوید چودھری لکھتے ہیں، تین دن آپ لکھو، اسی جگہ آپ کا کالم بھی شائع ہوگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چونکہ انہی دنوں حسن نثار ایکسپریس چھوڑ کر جنگ جا چکے تھے۔ جاوید چودھری صاحب کے جانے کی افواہ تھی۔ عباس اطہر صاحب نے سلطان لاکھانی صاحب کو کہا کہ چودھری صاحب چلے جائیں، تب بھی میں سنبھال لوں گا۔ انہوں نے مجھے جاوید چودھری کی جگہ پر اسی انداز میں کالم لکھنے کا کہا۔ شائد وہ مجھے متبادل کے طور پر تیار کرنا چاہ رہے تھے۔ شاہ جی کا کہنا تھا کہ میں جاوید چودھری کے انداز میں کہانی کے سٹائل میں کالم لکھوں۔ میرے لئے مشکل یہ آن پڑی کہ ایک ہی اخبار میں اسی جگہ پر ایک شخص کہانی کے انداز میں کالم لکھ رہا ہے اور میں بھی اسی انداز میں لکھوں گا تو صاف پتہ چلے گا کہ یہ جاوید چودھری کو کاپی کر رہا ہے۔ شاہ جی کا اصرار تھا کہ نہیں اسی انداز میں لکھو۔ میں نے آہستہ آہستہ ان کی ہدایات سے انحراف کرنا شروع کیا۔ ایک ٹیکنیکل طریقہ یہ نکالا کہ ان موضوعات کا انتخاب کیا، جن پر چودھری صاحب نہیں لکھتے تھے۔ جیسے طالبانائزیشن پر لکھنا شروع کر دیا۔ ان دنوں ملا فضل اللہ کا زور تھا۔ سوات میں فضل اللہ کے حامیوں کی کارستانیوں کے خلاف لکھنا شروع کیا اور پھر القاعدہ، افغان طالبان، ٹی ٹی پی وغیرہ پر بہت لکھا۔ اردو میں اس پر لکھنے والے بہت کم تھے، اس کی پذیرائی ہوئی۔ پھر کتابوں پر لکھا، ریسرچ آرٹیکل لکھے، نئے نئے آئیڈیاز پر لکھا۔ ان دنوں پڑھتا بہت تھا۔ گھنٹوں ایک کالم پر محنت کرتا۔ اس کا ثمر بھی ملا۔ چودھری صاحب کی ریڈرشپ بہت تھی، اسی جگہ چھپتا رہا تو میری بھی ریڈرشپ بننے لگی۔ کئی لوگوں نے بعد میں مجھے لکھا کہ ہم تو جاوید چودھری کو پڑھتے تھے، آپ کا کالم جس دن آتا تو غصے سے کہتے کہ یہ کہاں سے آ گیا، مگر پھر پڑھنا شروع کیا تو آپ کے بھی مداح ہو گئے۔

میرے مطالعہ کی رفتار

میری رفتار مطالعہ خاصی تیز ہے، اس کی وجہ شاید کرائے کی کہانیاں کم وقت میں پڑھ کر کم کرایہ ادا کرنے کی کوشش تھی لیکن وہ رفتار مطالعہ بڑھانے میں بہت مددگار نسخہ ثابت ہوا۔ ایک ہی رات میں "خلی پور کا ایلی" پڑھ ڈالی تھی۔ مطالعہ کے لیے کسی خاص ماحول کی ضرورت نہیں ہے بس موقع ملے، جہاں ملے پڑھنے کی چیز موجود ہو تو پڑھ لیتا ہوں۔ اب تو سفر ہی کم ہو گئے ہیں ورنہ سفر میں بھی پڑھتا تھا، نوٹس لینے کی خواہش تو ہمیشہ ہی رہی لیکن لے نہ سکا، خواہش ہوتی ہے کہ کچھ اہم کتابوں کے نوٹس لیے جائیں۔ مطالعہ کے ضمن میں یہی خواہش ہے کہ بچوں میں یہ ذوق پروان چڑھے، اس مقصد کے لیے بچوں کے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تمام رسائل گھر لگوا رکھے ہیں۔ ہمارے دور میں مطالعہ کے شوق کی ایک اہم وجہ تو یہ بھی بنی کہ گھر میں ٹی وی نہ تھا، وقت گزارنے کے لیے کتابیں ہی واحد سہارا تھیں۔ اب ٹی وی، کارٹون چینل، سوشل میڈیا، کمپیوٹر، ویڈیو گیمز اور نجانے کتنے مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اب یہ مشکل ہے کہ ٹی وی پر انسان وقت کا بہت سا حصہ ان معلومات کو حاصل کرنے میں لگا دے جس کا شاید اس کی زندگی میں کوئی کردار ہے نہ ہوگا۔

کتابیں خریدنے میں کنجوسی نہیں کی

اللہ کا شکر ہے کتابیں ہمیشہ ذوق و شوق سے خریدیں، لکھنے لکھانے کی وجہ سے تحائف بھی ملتے رہے لیکن کبھی کنجوسی نہیں برتی۔ جو کتاب جہاں سے ملی ضرورت ہوئی تو خرید لی، اس لیے پانچ، چھ ہزار کتابیں تو گھر میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس میں میرے لیے اہم کتابیں تو وہ ہیں جو مجھے محترم سرفراز احمد شاہ صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ دیں۔ کسی انسانی تصنیف کو انسان اس طرح پڑھے کہ وہ بالکل اس میں کھو جائے اور سب سے بے نیاز ہو جائے ایسا تو مشکل ہے۔، قرآن کے علاوہ شاید ہی ایسا ہو سکے۔ شاید خطبات اقبال اور کلیات اقبال ایسے کتابیں ہیں جن میں انسان کھو جائے۔ اس کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم کو پڑھنا اور سمجھنا کافی وقت طلب کام ہے، اس کے ساتھ کوئی حصن حصین جیسی ذکر، اوراد کی کتاب بھی ضروری ہے اور ستار طاہر کی کتاب اس لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر کی کتابوں کا خلاصہ میرے سامنے ہو اور میں اس سے لطف اندوز ہوتا رہوں۔ ملاقاتوں کے بارے کسی نے درست کہا تھا کہ جن کو پڑھو ان سے ملنے سے گریز کرو کیوں کہ بعض اوقات اچھا تاثر نہیں ملتا۔ بہرحال وزیر آغا، اشفاق احمد صاحب اور شہزاد احمد سے ملاقاتیں رہیں۔ مختار مسعود صاحب کسی تقریب میں موجود تھے وہاں ان کی مجلس میں کچھ دیر بیٹھا۔ وہ کمال کے انسان ہیں۔ میرے خیال میں مطالعہ کے ذوق رکھنے والے حضرات کو چاہیے کہ بلوغ العرب اور عربوں کی تاریخ کا مطالعہ ضرور کریں۔

کچھ سیاست کے متعلق

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ہمارا گھرانہ مسلم لیگی تھا لیکن جب 6 فروری 1996ء کو باقاعدہ صحافت میں آ گیا تو اس وقت سے لے کر آج تک میں بتدریج شریف فیملی سے متنفر ہوتا گیا۔ لاہور آ کر جب اہم حلقوں میں اٹھنا بیٹھا ہوا اور شریف فیملی کے متعلق بہت زیادہ منفی باتیں سننے کو ملیں تو ان سے الرجک ہو گیا۔ مجھے یہ بات تو سخت ناپسند تھی کہ یہ کہاں کا اصول ہے کہ بڑا بھائی پرائم منسٹر ہو اور چھوٹا بھائی پنجاب کا چیف منسٹر۔ یہ بات تو اخلاقی طور پر بھی درست نہیں کہ اہم عہدے اپنی ہی فیملی میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ رفیق تارڑ صاحب کو صدر پاکستان بنانے پر بھی مجھے ان کا یہ احمقانہ فیصلہ لگتا تھا یہ سارے اہم عہدے پنجاب ہی کے لیے کیوں ہیں۔ صدر اور وزیر اعظم کو پنجاب سے بنانے کے لیے کوئی جسٹی فکیشن ہی نہیں ہے۔ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری پر پابندی لگی تو میں نے اس کو سخت ناپسند کیا، پھر مجھے زیادہ غصہ اس پر آیا جب شہباز شریف نے کہا تھا کہ جب تک میں وزیر اعلیٰ ہوں یہ پابندی برقرار رہے گی۔ مجھے آج بھی احساس ہوتا ہے کہ اس وقت لوگ اس پابندی سے بہت تنگ آ گئے تھے۔ پھر مجھے نواز شریف کی یہ بات بھی سخت ناپسند تھی کہ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عباس اطہر دھڑے بندی والے شخص تھے

میرا کالم دانستہ یہ کہہ کر بند کر

دیا کہ جواب مضمون ہے

جب بھی اقتدار میں آتے سرکاری نوکریوں پر پابندی لگا دیتے۔ کچھ دنوں کے لیے پابندی ہٹا دی جاتی ہے اور اپنے لوگوں کو نوکریاں دے کر پھر پابندی لگا دی جاتی۔ پیپلز پارٹی آکر نوکریاں دیتی تھی اور یہ نوکریوں پر پابندی لگاتے تھے۔

عمران خان ناکام رہے لیکن انہیں وقت ملنا چاہیے

جہاں تک عمران خان کی بات ہے تو یہ مجھے بطور کھلاڑی تو ہمیشہ پسند رہے لیکن میں نے انہیں سیاست میں 2013ء کے بعد پسند کرنا شروع کیا۔ جب اس نے تبدیلی کا واضح نعرہ لگایا تو مجھے ان کا یہ وژن پسند آیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بندہ ریفارمز کی بات کر رہا ہے تو اسے موقع ضرور ملنا چاہیے۔ یہاں بتاتا چلوں کہ میں ہمیشہ ریفارمز کا حامی رہا ہوں اور انقلاب کا حامی کبھی نہیں رہا۔ میں بتدریج (Gradual) اصلاحات اور تبدیلی کا حامی ہوں۔ میرا جو تھوڑا بہت مطالعہ ہے اور جتنی میں سمجھ رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ انقلاب ہمیشہ نقصان پہنچاتا ہے اور خاص طور پر پاکستان جیسے ملکوں میں تو یہ بہت نقصان دہ ہے۔ اس کے بدلے ریفارمز ہونی چاہئیں اور سٹرکچر بدلنا چاہیے۔

عمران خان نے مایوس تو بہت کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے پورا وقت ملنا چاہیے۔ دیکھیں کہ عمران خان میں کچھ ایسی خوبیاں جو آج بھی ان میں باقی ہیں۔ ان کی ذاتی ایمانداری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ کرپٹ نہیں ہے۔ کوئی بندہ بھی عمران پر کرپشن کا جھوٹا الزام بھی نہیں لگا سکتا۔ حالانکہ جھوٹا الزام تو کسی پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی کریڈیبلٹی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے فلاں پوسٹ کے بدلے میں چار کروڑ روپے لے لیے۔ عمران پر اخلاقی الزام لگ جاتے ہیں اور لوگ بھی ان الزامات کو مان لیتے ہیں لیکن جہاں تک کرپشن کی بات ہے اس حوالے سے ان پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا۔ یہ عمران میں ایک ایسی خوبی ہے جو مین سٹریم سیاست میں کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے پاس یہ چیز ہے لیکن مین سٹریم پارٹی کوئی بھی ایسی نہیں ہے۔ عمران خان کو چیزوں کی سمجھ نہیں اور اس کی ناتجربہ کاریاں اس کی بڑی خامیاں ہیں۔ پھر اس کے دائیں بائیں بہت برے لوگ ہیں، اس کے پاس اچھی ٹیم تو بالکل بھی نہیں۔ یوں عمران خان اپنی ناتجربہ کاری اور بری ٹیم کی وجہ سے ہی قوم کو مایوس کر رہا ہے۔ بیوروکریسی میں بھی خامیاں ہوں گی لیکن تحریک انصاف کی اپنی نالائقیاں بھی ہیں۔ دیکھیں اس سے بڑی اور کیا نالائقی ہوگی کہ عثمان بزدار جیسے شخص کو پنجاب اور محمود خان جیسے بندے کو خیبر پختونخواہ کا چیف منسٹر بنا دیا گیا۔ ان لوگوں کی بالکل ایک فیصد بھی کپیسٹی نہیں اور یہ لوگ ان عہدوں کے ہرگز اہل نہیں۔ عثمان بزدار صاحب ساری زندگی بھی وزیراعلیٰ رہیں تو وہ لوگوں سے بات کرنا نہیں سیکھ سکیں گے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اکادمی ادبیات اور اس جیسے دیگر علمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ عمران خان کی ٹیم میں مجھے کوئی ایک بندہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو انہیں بتا سکے کہ فلاں بڑے ادیب یا صحافی کی اتنی خدمات ہیں اسے ایوارڈ ملنا چاہیے۔ ہارون الرشید، ارشاد احمد عارف، شامی صاحب جیسے لوگوں کو پچاس پچاس سال تو صرف صحافت میں ہو گئے ہیں انہیں ایوارڈ دیے جا سکتے ہیں۔ ان سے بہت کم تجربہ رکھنے والے صحافیوں کو مسلم لیگ نے ایوارڈز دیئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عمران کافی حد تک ناکام ہو چکا ہے اور ابھی مزید ناکام ہونے کا خطرہ بہر حال موجود ہے۔ لیکن اس کو اپنی ٹرم پوری کرنا چاہیے کہ شاید وہ قوم کو کچھ نہ کچھ ڈیلیور کر جائے۔ اگر یہ کچھ بھی ڈیلیور نہ کر سکا اور کچھ بہتر نہ کر سکا تو ہم اگلی بار اس کو سپورٹ نہیں کریں گے۔ جہاں تک بیوروکریٹس کی بات ہے تو میں نے آج تک کسی بھی بیوروکریٹ کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی میرا کسی کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں جو بھی خرابیاں ہیں ان کی ایک بڑی ذمہ داری بیوروکریسی پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہر دور کے حکمرانوں کو کرپشن کے محفوظ راستے یہی بیوروکریٹس دکھاتے ہیں۔ بیوروکریسی اگر صحیح کام کرے تو ملک میں بے شمار مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ میں نے عمران خان کے حق میں بھی لکھا اور اس کی غلطیوں پر شدید تنقید بھی کی۔ میں اس کے دھرنوں کے ہمیشہ خلاف رہا۔ میں ان کے غلط کاموں کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔ تحریک انصاف میرے لئے ایک پولیٹیکل آپشن ہی ہے، مسلم لیگ ن کی طرح، میرے خیال میں ن لیگ کو متواتر مواقع دینے کے بعد تحریک انصاف کو موقعہ دینا بنتا تھا۔ اسے اب پورا موقعہ ملنا چاہیے۔ پرفارم نہ کر پایا تو اگلی بار ووٹ نہیں ملیں گے۔

صحافیوں کی غیر ذمہ داری

میرا نواز لیگ اور پی پی کے حامی صحافیوں پر اعتراض ہی یہ ہے کہ اگر آپ کی نظر میں ان جماعتوں کی قیادت ٹھیک ہے تو کم از کم پھر ان کی غلطیوں پر بھی تو تنقید کریں۔ دیکھیں کہ ان سیاسی جماعتوں نے چھ، چھ سال تک بلدیاتی الیکشن نہیں کروائے لیکن یہ صحافی پھر بھی انہیں جمہوریت کا چمپیئن قرار دیتے رہے۔ ان صحافیوں میں یہ ہمت کیوں پیدا نہیں ہو سکی کہ انہیں کہہ سکیں کہ بلدیاتی الیکشن کروانا ایک آئینی ذمہ داری ہے وہ کروائے جائیں۔ 2010ء سے 2016ء تک پی پی اور نواز لیگ نے الیکشن نہ کروائے لیکن کوئی بھی صحافی نہیں بولا۔ یہ کتنی بڑی زیادتی اور کس قدر بڑا ظلم ہے۔ پھر جب اپنے ہی لوگوں کو بلدیاتی الیکشنوں میں کامیاب کروایا تو انہیں ایک نکے کا بھی اختیار نہ دیا اور ایک روپے کے فنڈ بھی نہ دیے۔ یہ تو حالت ہے جمہوریت کی علمبردار جماعتوں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں صحافیوں ہی کو ہائی لائٹ کرنا چاہیے تھیں۔ کیا ان صحافیوں کا حق نہیں بنتا تھا کہ وہ کہتے کہ جناب، جمہوریت کا ایک گراس روٹ لیول ہے اور بلدیاتی الیکشن جمہوریت کی پہلی سیڑھی ہے۔ عام سیاسی ورکر اور عام آدمی کا سیاستدانوں سے پہلا رابطہ ہی یونین کونسل لیول پر ہوتا ہے۔ لہٰذا بلدیاتی الیکشن بہت ضروری ہیں اور وقت پر ہونے چاہئیں۔

میں تحریک انصاف کے "پسندیدہ" صحافیوں میں شامل نہیں

حال ہی میں ایک دوست نے بتایا کہ تحریک انصاف کے کسی سوشل میڈیا سیل میں یا کسی اور فورم

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

الطاف حسن قریشی پرفیکشنسٹ لکھاری ہیں

ہر لفظ پر محنت کرتے اور خوب سے

خوب تر کے خواہاں رہتے

پر ایسے صحافیوں کی لسٹ بنائی جا رہی تھی کہ جو اس کو سپورٹ کرتے ہیں۔ اس موقع پر ایک صاحب نے کہا کہ عامر خاکوانی کا بھی نام شامل کرنا چاہیے وہ بھی ہمارے سپورٹر ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے کہا کہ ''آپ خاکوانی کو نہیں جانتے۔ وہ کسی بھی وقت پلٹا کھا سکتے ہیں۔ وہ ایک دودھاری تلوار ہے جو کسی طرف بھی چل سکتی ہے''۔ یہی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ سیاسی جماعتیں میرے متعلق یہ رائے رکھتی ہیں۔ اکثر صحافیوں نے جرنلزم کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے، اپنے وقار کا خیال نہیں رکھا اور وہ حکومتوں کے ترجمان بنے ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس پر خوشی ہوتی ہے کہ ہم اگر توازن کے ساتھ کسی جماعت کی حمایت کریں اور وہ ناخوش ہو کر ہمیں اپنی تقریبات میں نہ بلائے تو یہ ایک طرح سے اعزاز ہی ہے۔

جماعت اسلامی انقلاب نہیں اصلاحات چاہتی ہے

میں قومی سیاست میں تحریک انصاف کے ساتھ جماعت اسلامی کو بھی سپورٹ کرتا ہوں کیونکہ جماعت اسلامی اصلاحات کی بات کرتی رہی ہے۔ یہ واحد جماعت ہے جو اپنے اندر باقاعدہ الیکشن کراتی ہے اور اس میں موروثیت کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں۔ اس کی لیڈر شپ بدلتی رہتی ہے اور جتنے اچھے، کلین اور ایماندار اور سادہ لوگ جماعت اسلامی نے پروڈیوس کیے ہیں اور اسمبلیوں میں پہنچائے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جو بھی شریف اور محنتی آدمی ہوتا ہے جماعت اسلامی اسے آگے لے کر آتی ہے۔ دیکھیں کہ مولانا مودودی، میاں طفیل، قاضی حسین احمد، منور حسن اور سراج الحق اور دیگر بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے کردار کے حوالے سے کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ میں تو جماعت اسلامی کو سپورٹ کرتا ہوں یہ اور بات کہ جماعت مجھے اپنا سپورٹر نہ سمجھے۔ دراصل ہمارے ہاں پارٹیاں غیر مشروط حمایت پر یقین رکھتی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ سپورٹ نہ کی جائے بلکہ ان کی پالیسیوں کے آگے صحافی سرنڈر کر دے، تب وہ اسے اپنا سمجھتی ہیں۔ یہ ہم سے تو نہیں ہوتا بھیا۔

ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور زرداری

ذوالفقار علی بھٹو کو ایک کریڈٹ تو جاتا ہے کہ انہوں نے عوام کو متحرک کیا۔ گراس روٹ لیول پر ورکرز، مزدور اور کسان کو متحرک کیا۔ ان کی بعض شخصی خوبیاں بھی ہیں۔ بطور سیاستدان ان میں ایک بڑی خوبی یہ بھی کہ وہ ہزاروں لوگوں اور اپنے ورکروں کے نام سے واقف تھے۔ وہ عام کارکن کو بھی بائی نیم پکارتے تھے۔ لیکن ان کی ناکامی یہ ہے کہ انہوں نے ملک میں جمہوریت کا بیڑہ غرق کیا۔ مخالفین کو تشدد کا نشانہ بنایا اور انہیں راستے سے ہٹایا۔ صحافیوں کو جیلوں میں ڈالا۔ مجیب الرحمٰن شامی اور الطاف حسن

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قریشی جیسے لوگوں کو جیلوں میں ڈالا۔ حسین نقی جیسے لیفٹ کے کھرے شخص کو جیل میں ڈالا۔ نیپ پر پابندی لگائی، جے یو آئی کو نقصان پہنچایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد رضا خان قصوری کیس میں بھی وہ بہرحال شامل تھے ہاں انہیں پھانسی کی سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ ایسی بے شمار ایویڈنسز موجود ہیں کہ بھٹو نے مخالفین کو قتل کروایا ہے۔ پھر دیکھیں کہ بھٹو صاحب جو اصلاحات لے کر آئے تھے وہ بہت بری طرح فلاپ ہوئیں۔ بھٹو کے ویژن کی یہ حالت تھی کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ سوشلزم ختم ہونے جا رہا ہے لیکن وہ سوشلزم کا پرچار کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی انڈسٹری کا بیڑہ غرق کر دیا اور بینک تباہ کر دیئے۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو بطور سیاستدان تو بالکل ناکام رہے۔ ہاں بے نظیر بھٹو میں اپنے والد کی نسبت قائدانہ صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ ان میں رعونت اور تکبر نہ تھا جبکہ بھٹو صاحب کے چہرے سے بھی رعونت نظر آتی تھی اور اب تک ان کے متعلق جو بھی پڑھا ہے اور سنا ہے وہ مجھے فرعون صفت لگے ہیں۔ پی پی کے اپنے لوگوں نے بھی ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت زیادہ رعونت تھی۔ بی بی میں یہ چیزیں نہ تھیں، وہ ایک سافٹ مائنڈڈ عورت تھیں اور ان کی ورکرز سے محبت بھی بہت تھی۔ مگر بعض چیزوں سے اوپر نہ اٹھ سکیں، وہ زرداری صاحب کو انتظامی معاملات میں مداخلت سے روک نہ پائیں، سندھ کارڈ تو بی بی نے بھی استعمال کیا، بی بی کی بڑی خامی یہ تھی کہ وہ پاکستانی سماج کے بنیادی فیبرک کو نہ سمجھ سکیں، انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ پاکستان میں لوگ مذہب اور ختم نبوت ﷺ کے حوالے سے کس قدر حساس ہیں، جبکہ پاک بھارت تعلقات کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ زرداری صاحب تو بالکل صاف کریمنل اور کرپٹ انسان ہیں، ان کا تو سیاست سے کیا لینا دینا، وہ یہاں صرف کمانے ہی آئے۔ مجرمانہ سوچ کے ساتھ سیاسی چالبازیاں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ آخری تجزیے میں زرداری بالکل ناکام رہے اور پیپلز پارٹی کو تباہ کیا۔ مجھے زرداری سخت ناپسند رہے ہیں اور مجھے ان سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ مجھے تو پیپلز پارٹی کے کلچر پر بہت افسوس ہوتا ہے کہ 27 دسمبر 2007ء کی شام پانچ بجے تک زرداری پیپلز پارٹی میں سب سے ناپسندیدہ ترین انسان تھا۔ ہم جس پیپلز پارٹی والے سے بھی بات کرتے تھے وہ زرداری کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ زرداری کو بی بی نے پاکستان نہیں آنے دیا تھا، ان کے بارے میں طے ہو چکا تھا کہ وہ باقی عمر باہر رہ کر بچوں کا خیال رکھیں گے۔ انہوں نے بس بچے ہی کھلانے ہیں لیکن میں پیپلز پارٹی پر حیران ہوں کہ یہ شخص 27 دسمبر 2007ء کی شام پانچ بجے کے بعد پیپلز پارٹی کا اہم ترین لیڈر بن گیا۔ پیپلز پارٹی بھی اس لحاظ سے غلام ابن غلام جماعت ہے۔ یہ لوگ فکری طور پر غلام ہیں۔ ذاتی طور پر میری اس سے بڑھ کر کوئی تذلیل نہیں کہ میں ایک پولیٹیکل لیڈر کو سپورٹ کر رہا ہوں اور وہ مجھے آگے نیچ دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بے نظیر بھٹو کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اپنی وصیت میں زرداری کو پی پی کا قائد نامزد کر دیتیں۔ یہ تو پارٹی کے ورکرز خود فیصلہ کرتے کہ کس کو قائد ہونا چاہیے۔ کیا یہ لاکھوں لوگ کوئی بھیڑ بکریاں ہیں کہ انہیں جدھر مرضی ہانک دیا جائے۔ پی پی ورکروں کی بھی حالت دیکھیے کہ ان کی زنجیر جسے مرضی پکڑا دی جائے وہ اسی کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ نتیجہ دیکھیے کہ زرداری جیسے شخص نے پی پی کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جاوید چودھری نے بڑی مقبولیت کمائی مگر پھراسے گنوادیا، ان کے ہاں کالم صرف پراڈکٹ ہے، جسے بکنا چاہیے

بلاول زرداری کی مضحکہ خیز نقالی

بلاول زرداری مجھے اچھا لگا تھا کہ یہ ایک نوجوان ہے، پڑھا لکھا ہے اور خوش شکل ہے۔ یہ ہمیں اپنے بچوں جیسا لگتا ہے لیکن اس نے ابھی تک کوئی ایسی چیز ثابت نہیں کی کہ وہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آیا ہے۔ اس کا کنٹری بیوشن تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے بھٹو صاحب کی نقالی کے اس کے پاس بھی کچھ نہیں ہے اور وہ نقالی بھی ایسی ہے کہ جسے ہم مضحکہ خیز کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ تقریر کرتے ہیں تو ہر فقرے پر مسکراتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ Sad جملے بھی مسکرا کر ادا کرتے ہیں۔ اردو کی تقریر میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے رٹے سے کام لیا ہوگا اور رومن میں لکھی تقریر پڑھ رہا ہے لیکن وہ انگریزی تو بہت اچھی بولتا ہے۔ وہ انگریزی گفتگو میں بھی ایسے جملوں پر ہنستا ہے جن پر رونا چاہیے۔ میرے خیال سے ان کو کسی نے بتا دیا ہے کہ تقریر میں ہمیشہ مسکرانا چاہیے تو وہ بس مسکراتے ہی رہتے ہیں۔ صوبہ سندھ سنبھالے ہوئے بلاول کو چھ سات سال ہو گئے ہیں اور کوئی ایک بھی ایسا شعبہ نہیں جس میں اس نے کوئی اصلاحات کی ہوں۔ ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ بلاول کی حالت یہ ہے کہ اس کے صوبے میں سب سے بری حالت بلدیاتی اداروں کی ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ جن مغربی اداروں میں پڑھ کر آیا ہے وہاں پر بلدیاتی ادارے کس قدر طاقت ور ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم اور صحت کے معاملے میں بھی اس کی کارکردگی زیرو ہے۔ یہ تو اپنے لاڑکانہ شہر ہی کو تبدیل نہیں کر سکا۔ ان کے پاس اتنے فنڈز ہیں اور یہ تبدیلی لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس دراصل وژن نہیں ہے چنانچہ یہ بھی روایتی سیاست کو لے کر چل رہا ہے۔ بلاول کی غیر سنجیدگی دیکھیں کہ زرداری کی بیماری کی بنیاد پر ضمانت ہوئی ہے اور یہ جلسے میں دھاڑ رہا تھا کہ "آ گیا زرداری۔ شیروں کا شکاری"۔ یہ کس طرح کی فضول اور سطحی باتیں ہیں، ایک لیڈر کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلاول و آصفہ کا قومی سطح پر کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہے۔ سندھ کے لیول پر چونکہ پی پی کے مقابلے میں کوئی اور پارٹی ہی نہیں تو یہ وہاں پر لوگوں کو بے وقوف بناتی رہے گی۔

مذہبی سیاسی جماعتیں، تضادات کا مجموعہ

مذہبی جماعتیں شروع سے ہی ناکام ہوتی آئی ہیں۔ خیبر پختونخواہ میں ایم ایم اے کو جو کامیابی ملی تھی وہ بھی حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ اصل میں مذہبی سیاست میں تضادات بہت ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن جیسی موقع پرست اور بدترین سیاست شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مولانا نے جماعت اسلامی کو بھی اپنے اتحادوں میں شامل کر کے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے۔

مذہبی سیاسی جماعتوں میں جماعت اسلامی ایک

Scanned with CamScanner

صاف ستھری جماعت ہے۔اس کے پاس اچھے اور ایماندار لوگ ہیں لیکن اس کے پاس بھی وژن اور سیاسی بصیرت کی کمی ہے۔نئے خیالات کی وہاں کوئی گنجائش نہیں، ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔حالیہ الیکشن سے پہلے جماعت اسلامی ایم ایم اے میں شامل ہوئی حالانکہ یہ بالکل غلط وقت پر غلط فیصلہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا فضل الرحمٰن کی جے یو آئی اور جماعت اسلامی میں کچھ بھی کامن نہیں ہے۔مولانا کہتے تھے کہ فاٹا کا انضمام یہودی سازش ہے اور جماعت اسلامی اس کی حامی تھی۔مولانا پانامہ کو بھی سازش اور فراڈ کہتے تھے اور جماعت اسلامی اس کی حامی تھی کہ پانامہ کیس میں شامل 400 لوگوں کا مکمل احتساب ہونا چاہیے۔جماعت اسلامی کہتی تھی کہ کرپشن بالکل ختم ہو اور مولانا کہتے تھے کہ کوئی کرپشن نہیں ہے یہ سب سازشی باتیں ہیں۔یوں جماعت اسلامی اور جے یو آئی میں کچھ بھی مشترک نہیں۔بس جماعت صرف چند سیٹوں کے چکر میں ایم ایم اے کا حصہ بن گئی اور اس سے اس کا سیاسی مستقبل داؤ پر لگ گیا۔مذہبی جماعتیں اس لیے بھی سیاست میں ناکام ہیں کہ وہ جن اخلاقیات کا دعویٰ کرتی ہیں وہ خود پیش نہیں کر سکیں۔مذہبی جماعتیں تضادات کا مجموعہ ہیں۔ان جماعتوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ نوجوان نسل کے لیے کشش کا باعث نہیں بن سکیں اور انہیں کوئی پروگرام نہ دے سکیں۔یہی وجہ ہے کہ مذہبی طور پر جو نظریاتی لوگ تھے وہ ان سیاسی جماعتوں کے بجائے جہادی تنظیموں، القاعدہ اور دیگر شدت پسند جماعتوں میں شامل ہو گئے۔یہ بھی ان جماعتوں کے لیے بہت بڑا المیہ ہے۔اس سے ہمارے ملک کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا اور شدت پسندی میں اضافہ ہوا۔

سیاستدانوں سے ملنے سے کتراتا ہوں

میرے اندر ایک خامی رہی ہے کہ میں سیاسی طور پر کبھی ایکٹو نہیں رہا بلکہ میں سوشل ایکٹویسٹ بھی نہیں ہوں اور گھر پر ہی رہنے کا عادی ہوں۔دفتر سے گھر، گھر سے دفتر اور بس کتابوں کا مطالعہ۔اصل میں میرے کچھ ذاتی مسائل اس قدر رہے ہیں کہ مجھے وقت نہیں مل سکا۔دوسرا سیاستدانوں کے متعلق سچ پوچھیے تو مجھے کبھی طلب نہیں رہی کہ میں ان کے پیچھے بھاگوں اور ان سے ملاقاتیں کرتا پھروں۔مجھے یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگتا کہ بطور صحافی اور کالم نگار ان کے پیچھے پھرتا رہوں اور ان کے نغمے گاتا رہوں جب ان کا کچھ وژن ہی نہیں ہے تو پھر میرے خیال سے ان کے پیچھے بھاگنا اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے اور یہ سخت صحافتی بددیانتی بھی ہے۔ کونسل آف نیشنل افیئرز نے ہماری کچھ ملاقاتیں میاں نواز شریف، منور حسن، یوسف رضا گیلانی وغیرہ سے کروائی تھیں لیکن سچ پوچھیں تو مجھے ان لوگوں میں وژن کی سخت کمی محسوس ہوئی ہے۔عمران خان صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ان میں بہت سی خامیاں ہیں مگر بہرحال تبدیلی کا نعرہ تو لگایا، باقی تو نعرہ بھی نہیں لگاتے۔عمران خان شریف اور زرداری خاندان کی نسبت بہتر لگے۔ہاں اگر انہوں نے بھی قوم کو مایوس کیا تو پھر میں ان کی حمایت بھی چھوڑ دوں گا۔میں اس لیے بھی سیاستدانوں سے ملنے میں کتراتا ہوں کہ جب آپ ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق قائم کر لیتے ہیں تو پھر ان پر کھل کر تنقید کرنا اور ان کی کمزوریوں پر گرفت کرنا آپ کے خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔مجھے اگر کسی سیاستدان کے متعلق کوئی انفارمیشن بھی چاہیے تو میں کوشش کرتا ہوں کہ براہ

Scanned with CamScanner

ہارون الرشید سے تیز کالم لکھتے کسی کو نہیں دیکھا

وہ اپنی تحریر کو بے رحمی سے ایڈٹ کرتے ہیں

ان سے خاصا کچھ سیکھا

راست رابطہ نہ کروں اور دیگر ذرائع سے اس کے متعلق جاننے کی کوشش کروں۔

مجھے صوفی سکالرز زیادہ پسند ہیں

میں دور حاضر کی کسی بھی مذہبی شخصیت سے متاثر نہیں، ہاں مجھے صوفی سکالرز زیادہ پسند ہیں۔ میں مولانا مودودی صاحب اور امین احسن اصلاحی کا احترام کرتا ہوں، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر حمیداللہ کی تحریریں اچھی لگیں، مولانا مناظر احسن گیلانی اچھے لگے، آج کل مولانا تھانوی کی کتب پڑھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کی محاضرات والی سیریز مجھے پسند ہیں، ان میں خاصا توازن ہے۔ علامہ یوسف قرضاوی کی دو کتابوں کے تراجم پڑھے، بہت اچھے لگے، اخوان کے بانی سید حسن البنا کی کتاب بھی اچھی لگی، سید قطب میں بھی بہت توانائی ہے۔ علامہ اسد کی تحریر اور خیالات مجھے اچھے لگے، علامہ اسد کو پسند کرتا ہوں۔ مولانا آزاد کو تفصیل سے پڑھا ہے، مولانا کی انشاپردازی کون قائل نہیں ہوگا، ان میں علمیت بھی ہے، مگر ایک خاص قسم کا تکلف تحریر میں ہے۔ مولانا آزاد کی سیاسی سوچ سے مجھے سخت اختلاف ہے، مجھے حیرت ہے کہ ان جیسا دانا شخص پاکستان کی مخالف صف میں کھڑا تھا۔ ان کے حامی مولانا آزاد کی پیش گوئیوں کا بہت ذکر کرتے ہیں، میں یہ سوچتا ہوں کہ جو شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ کانگرس اسے استعمال کرنے کے بعد دودھ میں گری مکھی کے مانند نکال کر پھینک دے گی، وہ بھارت میں شدت پسند ہندو خیالات کے عروج کے بارے میں اندازہ نہ کر پائے تو پاکستان کے بارے میں کیا انہوں نے پیش گوئی کرنی ہے۔ آخری تجزیے میں مولانا آزاد کی حیثیت ایک ناکام سیاستدان کی ہے۔

صوفی سکالرز میں میں سرفراز شاہ صاحب کے بہت قریب ہوں۔ یہ میرے مرشد ہیں۔ میری پہلی کتاب کا انتساب بھی انہی کے نام ہے۔ میں ان کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ پروفیسر احمد رفیق اختر اور احمد جاوید صاحب کا میں احترام کرتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں احمد جاوید صاحب سے نئی چیزیں سیکھوں۔ پروفیسر ہمایوں احسان صاحب ہمارے سی این اے کے ساتھی اور اعلیٰ پائے کے دانش ور اور سکالر ہیں۔ بہت ہی آؤٹ آف باکس سوچنا میں نے انہی سے ہی سیکھا ہے۔ ڈاکٹر عاصم اللہ بخش کا تجزیہ بہت اچھا ہوتا ہے، میں ان سے بہت متاثر ہوں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے تو مجھے ڈاکٹر عاصم اللہ بخش اور پروفیسر ہمایوں احسان میں یہ مومنانہ فراست نظر آتی ہے۔

ہمارا نمبر ون مسئلہ کرپشن ہے

پاکستان کا نمبر ون مسئلہ میرے نزدیک کرپشن ہے۔ میں ان لوگوں کے خلاف ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ یہاں سیاسی عدم استحکام ہے اور کرپشن کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ جو بندہ یہ کہتا ہے کہ پاکستان میں کرپشن

Scanned with CamScanner

بڑا مسئلہ نہیں ہے وہ در حقیقت کرپشن کو سپورٹ کر رہا ہے۔ عام آدمی کو ہر معاملے میں جس چیز سے تکلیف پہنچتی ہے وہ کرپشن ہے۔ پولیس آپ کے ساتھ درست سلوک نہیں کرتی، ملزم رہا کر دیئے جاتے ہیں، آپ ہسپتال جاتے ہیں اور آپ کو دوا نہیں ملتی، کسی بھی سرکاری دفتر میں جائز کاموں پر بھی پیسے طلب کیے جاتے ہیں۔ ہر شعبے میں ہمیں کرپشن ہی تنگ کر رہی ہے۔ کرپشن ہی کی وجہ سے جعلی دوائیاں بن رہی ہیں اور اسی وجہ سے دیگر جرائم ہو رہے ہیں۔ اس کے خاتمے کے لیے ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے رول آف لاء۔ قانون پر عمل درآمد سختی سے ہونا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ وار اگینسٹ ٹیررازم ہے۔ اسی طرح "وار اگینسٹ لاء لیس نیس" بھی ہونی چاہیے اور لاقانونیت کے خلاف جنگ ہونی چاہیے۔ کرپشن کوئی بھی کرے بھلے وہ نواز شریف ہو یا عمران سب کے خلاف بلاامتیاز کارروائی ہونی چاہیے۔ جو لوگ کرپٹ ہیں انہیں عبرت ناک سزائیں ملنی چاہئیں۔ پاکستان میڈیکل ڈینٹل کونسل بنا ہوا ہے۔ اس کو تیس چالیس سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ مجھے بتائیے کہ اس ادارے کی طرف سے کسی ایک بھی ڈاکٹر کو سزا ملی ہے اور اس کا لائسنس کینسل کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے لاتعداد کیسز ہیں جب ایک مریض کا غلط آپریشن کر دیا گیا ہے لیکن ذمہ دار ڈاکٹر کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

نیب اپنی ساکھ نہیں بنا سکا

احتساب کے معاملے میں پوری قوم کو ایک ہونا ہوگا اور کرپٹ لوگوں کے خلاف بے رحم احتساب ہونا چاہیے۔ جہاں تک نیب کی بات ہے تو اس نے بھی قوم کو مایوس کیا اور یہ اپنی بہتر ساکھ نہیں بنا سکا۔ اس احتساب کی حالت یہ ہے کہ مسلم لیگ نواز کا جو بھی بندہ ذرا اونچا بولتا ہے اس کے خلاف نیب فوری طور پر ایکشن لیتا ہے اور اس کے خلاف کرپشن کے کیس دائر کر دیئے جاتے ہیں، جو خاموش ہیں ان کے خلاف کوئی کیس نہیں۔ نیب کی سرگرمیاں ہی دراصل مشکوک ہیں۔ اب دیکھیں کہ گجرات کے چودھری صاحبان کا بھی تو دامن صاف نہیں لیکن یہ لوگ اقتدار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف نیب کی کوئی سرگرمی نہیں ہے۔ ق لیگ کے اور بھی بہت سے رہنما ہیں جنہوں نے کرپشن کی ہے لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو رہی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بی آر ٹی منصوبے کی ناکامی اور اس میں کرپشن پر سابق وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا اور تحریک انصاف کے رہنما پرویز خٹک کے خلاف بھی کارروائی ہونی چاہیے۔ تحریک انصاف کے کرپٹ لوگوں کے خلاف بھی تو نیب کو ایکٹو ہونا چاہیے۔ ان کے بارے میں نیب کی خاموشی نے بہت ہی غلط تاثر پیدا کر دیا ہے۔ قانون میں اس قدر خامیاں ہیں کہ جو بھی کرپشن میں پکڑا جاتا ہے وہ جلد ہی چھوٹ جاتا ہے اور اس سے کچھ برآمد بھی نہیں کیا جاتا۔ مجھے احتساب کے حوالے سے کسی بھی جماعت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور میں بے رحم احتساب کا حامی ہوں۔ لیکن یہ بے رحم احتساب کب ہوگا، ایسا جلد ہوتا نظر نہیں آتا۔

ختم نبوت ہمارا بنیادی اور ٹھوس عقیدہ

حج فارم میں سے ختم نبوت کی شق کے خاتمے پر حیران ہوں کہ اس معاملے پر کوئی شور نہیں اٹھا۔ میں ختم نبوت کے حوالے سے تمام قوانین کا زبردست حامی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنا بھی اس حوالے سے انٹرنیشنل پریشر ہو ہمیں اپنے قوانین پر قائم رہنا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نذیر ناجی کو ورکر نواز ایڈیٹر پایا

مگر وہ کانوں کے کچے اور جلد گمراہ ہو جاتے

کئی بار آرڈر پر دستخط کر کے بھول جاتے

چاہیے۔ ہاں اگر ان میں پروسیجر تبدیلی بھی کرنی ہو تو وہ مفتی تقی عثمانی صاحب، مفتی منیب الرحمٰن صاحب جیسے علمائے کرام سے مشاورت کر کے کرنی چاہیے اور اس کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم اسلامی نظریاتی کونسل بھی موجود ہے۔ کوئی بھی ایسا نیا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے ان قوانین پر زد پڑتی ہو۔ اگر جج فارم میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط کیا گیا۔ اس سے پہلے نواز شریف کے دور میں زاہد حامد نے جو کچھ کیا تھا میں نے اس کی بھی کھلی مخالف کی تھی۔ اگر اس حوالے سے کوئی تبدیلی کرنی ہے اور کوئی ٹیکنیکل پرابلم ہے تو چھپ چھپا کر اس میں ترمیم و اضافہ کرنے کے بجائے علمائے کرام کو اعتماد میں لے کر یہ کام کرنا چاہیے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اسی کام کے لیے بنائی گئی ہے کہ اس کی سفارشات پر عمل کیا جائے۔ ختم نبوت ہمارا بنیادی عقیدہ ہے اور اس پر ہمیں بڑا واضح اور ٹھوس رہنا چاہیے۔

اخوان المسلمون کے مرشد عام کا انٹرویو

زندگی کا یادگار واقعہ

میں نے بیرون ممالک زیادہ سفر نہیں کیے، مصر، نائیجیریا، ترکی اور افغانستان جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی سعادت نصیب ہوئی کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے مرشد عام مہدی عاکف کا میں نے انٹرویو کیا۔ ان کے علاوہ ان کے نائب اعصام الریان، ڈاکٹر مرسی شہید کے مقابلے میں الیکشن لڑنے والے ایک بہت ہی بڑے لیڈر تھے ڈاکٹر ابوالمنعم عبدالفتوح اور دیگر لیڈروں کے بھی انٹرویوز کیے۔ ڈاکٹر ابوالمنعم عبدالفتوح (ان کا جیل ہی میں انتقال ہوا) ایک بہت ہی مقبول لیڈر تھے جنہوں نے مرسی کے مقابلے میں الیکشن لڑا اور بہت سے ووٹ حاصل کیے۔ یہ بعد میں اخوان سے الگ ہو گئے تھے اور انہوں نے مرسی کو سپورٹ کیا۔ اخوان کے مرشد عام کا مطلب ہے پوری دنیا میں اخوان کا ایک ہی مرشد عام ہے۔ انگریزی میں اسے ''جنرل گائیڈ'' کہا جاتا ہے۔

مجھے اخوان المسلمون کی قیادت نے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر مرسی سے بھی ملاقات ہوئی۔ غرض ہم اخوان المسلمون کی ٹاپ لیڈرشپ سے ملے اور بہت متاثر ہوئے۔ ان سے کافی سیکھنے کو ملا اور بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہوئیں۔ پاکستان کے متعلق ان کی رائے بہت اچھی تھی اور وہ پاکستانی عوام کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے لیکن انہوں نے زرداری صاحب پر بہت تنقید کی۔ اس وقت زرداری صدر تھے۔ مرشد عام نے کہا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ پاکستان ہمارا دوست ملک ہے اور اس پر ایک قاتل اور کرپٹ شخص کی حکمرانی ہے۔ اس بات پر مجھے حیرت ہوئی، مگر مہدی عاکف نے نہایت خلوص سے یہ بات کی تھی، ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ مصر میں اخوان المسلمون کے خلاف بہت زیادہ آپریشن کیے گئے لیکن

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسے ختم نہ کیا جا سکا۔ ہمیں اخوان کے ایک سینئر پروفیسر ڈاکٹر نے بتایا کہ میں ہفتے میں تین دن کام کرتا ہوں، تین دن دعوت کا کام کرتا ہوں اور صرف ایک دن گھر پر رہتا ہوں۔ آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ اخوان المسلمون میں کیسے وژنری لوگ پائے جاتے ہیں۔ اخوان المسلمون میں کارکن کی تربیت کا بہت عمدہ نظام ہے۔ میں نے مرشد عام سے سوال کیا کہ اخوان المسلمون کے بانی حسن البناء شہید تو ایک صوفی تھے تو کیا آپ بھی صوفی ہیں یا انقلابی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم صرف پانچ فیصد سیاسی ہیں جبکہ اصل کام ہی دعوت کا ہے۔ نوے پچانوے فیصد اخوان سوشل ورکر اور ریفارمر ہیں۔ تعلیم، تربیت اور دعوت کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ ہم انقلاب کے سخت خلاف ہیں اور یہ جعلی لفظ ہے۔ ہم تو ریفارمز کے حامی ہیں۔ ہم کرپشن کا خاتمہ اور حقیقی آزادی چاہتے ہیں۔ ہر شعبے میں ریفارمز ہونی چاہییں۔

مصر میں خان یونس ایک مشہور مقام اور بازار ہے۔ ہم وہاں گئے تو راستہ بھول گئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور ہمیں بڑے جوش و خروش سے ملے۔ حالانکہ ہر دور میں مصری حکومتیں پاکستان کے خلاف رہی ہیں لیکن عوام پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو ڈرائیور کو پتہ چلا کہ پاکستانی ہیں تو وہ ترنت بولا "پاکستان۔ دی کنٹری آف اسامہ بن لادن"۔ (اس وقت ابھی اسامہ بن لادن کے خلاف ایبٹ آباد آپریشن نہیں ہوا تھا)۔ بعد میں ایک مشہور امریکی ادارے PEW نے مصر کے حوالے سے اپنی سروے رپورٹ میں کہا تھا کہ 87 فیصد مصری عوام اسامہ سے محبت کرتے تھے۔ اخوان المسلمون کے علاوہ وہاں کے عام شہری بھی امریکہ کے بہت مخالف ہیں۔ ہم جامعہ ازہر میں بھی گئے اور وہاں پر عصر کی نماز ادا کی۔ میرا مصر کا دورہ بہت اچھا رہا۔ سکندریہ کی تاریخی لائبریری دیکھی۔

ترکی دو بار جانا ہوا، پہلی مرتبہ 2011ء میں مجیب الرحمٰن شامی، عطاء الحق قاسمی اور رؤف طاہر کے ساتھ۔ ہمیں فتح اللہ گولن کی تنظیم کی جانب سے ترکی کا دورہ کروایا گیا تھا۔ افغانستان جانا ہوا تو حامد کرزئی، افغان صدر اشرف غنی، عبداللہ عبداللہ اور دیگر افغان لیڈروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

پاکستان ناکام نہیں ہوا، مسلم اخلاقیات ناکام ہوئی

بھارتی مسلمانوں کے بارے میں تو دیکھ رہا ہوں کہ جس طرح مودی حکومت آر ایس ایس اور دیگر ہندو شدت پسند تنظیموں کو سپورٹ کر رہی ہے اس سے انڈیا خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور کچھ روحانی پیش گوئیاں بھی ایسی رہی ہیں کہ انڈیا ساؤتھ سے ٹوٹ جائے گا۔ یہ جو شاہین باغ اور آسام کے ہنگامے ہو رہے ہیں تو اس پس منظر میں مجھے روحانی پیش گوئیاں درست ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ انڈیا اپنے متعصبانہ رویوں ہی کی بدولت خودکشی کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے۔ ریاستوں کا نظام اس طرح نہیں چلا کرتا جس طرح مودی سرکار چلا رہی ہے۔ جہاں تک مقبوضہ کشمیر کا تعلق ہے تو اس حوالے سے بعض لوگ کہتے ہیں پاکستان کے اقدامات کافی نہیں ہیں لیکن میرا سوال یہ ہے کہ اب مزید پاکستان کشمیر کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ ہم نے مسلح جدوجہد کر کے اور جہادی تنظیموں کو سپورٹ کر کے دیکھ لیا ہے اور اقوام متحدہ میں بھی احتجاج کر کے دیکھ لیا ہے۔ پاکستان تمام حربے آزما چکا ہے لیکن جب عالمی ضمیر

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ارشاد احمد عارف سے زیادہ

متحمل، بردبار اور

وسیع ظرف صحافی نہیں دیکھا

ہی مردہ ہو جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان نے کافی کچھ کیا ہے اور کر بھی رہا ہے اور اس سے شکوہ کرنا درست نہیں۔ آپ مغربی ممالک کو ایک طرف رکھیں مسلم ممالک ہی کو دیکھ لیں سب ڈھیٹ بنے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی کشمیر کے حق میں بات کرنے کو تیار نہیں تو ایسے بے ضمیروں کے ضمیر کو جگانے کے لیے پاکستان کیا کر سکتا ہے۔ جس وقت مودی کشمیر میں بربریت کا مظاہرہ کر رہا تھا عرب امارات میں اسے ایوارڈ دیے جا رہے تھے۔ یہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی ہرگز نہیں بلکہ مسلم اخلاقیات کی ناکامی ہے۔ خارجہ پالیسی کیا ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارا ہمسایہ ہی بے شرمی اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے تو اس کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی تو خارجہ پالیسی کی کامیابی ہے کہ ترکی اور ملائیشیا نے کھل کر کشمیر کاز کی حمایت کی ہے۔ او آئی سی کتنی بڑی تنظیم تھی جو اب بالکل مردہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس تنظیم کے باقاعدہ اجلاس بھی نہیں ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کو ناکام قرار دینے کے بجائے اسے امت مسلمہ کی ناکامی قرار دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

پاکستان میں دہشت گردی اور شدت پسندی

نائن الیون کے بعد جب پاکستان طالبان کے خلاف امریکی اتحادی بنا تو یہ دراصل پاکستان نے ڈبل گیم کی۔ اس نے شروع میں تو ملا عبدالسلام ضعیف اور ایک آدھ طالبان لیڈر کو امریکہ کے حوالے کیا لیکن بعد میں اس نے فیصلہ کیا کہ افغان طالبان اور قیادت کو پروٹیکٹ کرنا ہے اور انہیں امریکہ کے حوالے نہیں کرنا۔ پاکستانی فوج نے حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کو بچایا اور انہیں گرفتار نہ ہونے دیا۔ ہمارے جو مذہبی لوگ اور مذہبی جماعتیں تھیں انہیں اس بات کا بالکل علم تھا کہ پاکستان ڈبل گیم کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہ غلط کام کیا کہ فوج اور ریاستی اداروں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا، صرف چھوٹے مفادات کی خاطر ایسا کیا گیا۔ مفتی نظام الدین شامزئی جیسے عالم نے بھی فتوے دیے کہ فوجیوں کے جنازے پڑھنا جائز نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط بات تھی، جب مذہبی جماعتیں فوج کی ڈبل گیم سمجھ گئی تھیں تو انہیں پروپیگنڈہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اس وقت جنرل پرویز مشرف یا کوئی بھی جنرل علانیہ طور پر تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم امریکہ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام میڈیا میں موجود کچھ لوگوں کو کرنا چاہیے تھا اور مذہبی طبقے کو اصل صورتحال سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے ذریعے لیک کروائی جاتی کہ جن کی کوئی باقاعدہ حیثیت نہیں تھی۔ مثال کے طور پر قاضی حسین احمد جیسا شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ نہیں ہماری فوج ''پراکسی آرمی'' نہیں اور یہ طالبان کی حامی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں نے الٹا یہ تاثر دیا کہ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پاکستانی فوج امریکہ کی پراکسی آرمی ہے جس سے فوج کے خلاف نفرت بڑھی اور شدت پسندی میں اضافہ ہوا۔ یہ ہماری بنیادی غلطی تھی جس سے ہمارے ہاں شدت پسندی اور دہشت گردی بڑھی۔ پھر ٹی ٹی پی وجود میں آئی اور ان شدت پسندوں کو انڈیا جیسے ممالک نے بھی استعمال کیا۔ یہ سب افسوسناک ہے۔

میرے خیال سے سٹیٹ سے دو بڑی غلطیاں ہوئی ہیں: پہلی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے پاکستان کے مذہبی طبقے کو افغان طالبان قیادت کے ساتھ ڈائریکٹ کر دیا تھا۔ میں نے 1999ء میں کمانڈر الیاس کشمیری (یہ بعد میں مارے گئے تھے) کا انٹرویو کیا تھا جو اگست 1999ء کے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ہم کشمیر فتح کر لیتے ہیں تو ہم جونا گڑھ اور حیدر آباد کی طرف بڑھیں گے۔ میں ان کی باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ یہ تو کوئی گلوبل ایجنڈا ہے جس پر یہ عمل پیرا ہیں۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ جب تک ریاست فتویٰ نہ دے جہاد نہیں ہوتا تو ان کا کہنا تھا کہ ہمارے امیر المومنین تو ملا عمر ہیں۔ میں ان کے جواب سے بڑا حیران ہوا کہ یہ خود تو پاکستانی ہیں اور پاکستان میں رہتے ہیں لیکن بات ملا عمر کی مانتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر کل کو پاکستان کے افغان طالبان کے ساتھ معاملات خراب ہو جاتے تو پھر یہ لوگ تو افغان طالبان کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر واقعی ایسے ہوا اور ایسے لوگوں نے پاکستان کے مقابلے میں افغان طالبان کو ترجیح دی جس سے حالات بہت خراب ہوئے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں الیاس کشمیری نے کہا تھا کہ مجھے عربوں نے افغانستان میں عسکری ٹریننگ دی۔ میں نے حماس اور القاعدہ کے لوگوں کے ساتھ رہ کر کام کیا ہے۔

حرکت الجہاد الاسلامی، حرکت المجاہدین، حرکت الانصار جیسی پاکستانی جہادی جماعتوں پر عربوں کا زیادہ اثر رہا ہے اور یہ جماعتیں افغانستان میں عربوں کے بہت قریب رہی ہیں۔ یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی غفلت تھی کہ اس نے اپنے لوگوں کو اتنی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی جس سے بعد میں ہمارے اپنے لیے بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ میرا یہ نقطہ نظر ہے کہ جس طرح لشکر طیبہ کو الگ رکھا گیا اور اسے افغان طالبان کے قریب نہیں جانے دیا گیا تو اسی طرح دیگر جہادی تنظیموں کو بھی کنٹرول کیا جاتا۔

قطر معاہدہ۔ طالبان کی واضح فتح ہے

امریکہ طالبان معاہدے بارے میں میرا موقف یہ ہے کہ یہ طالبان کی واضح فتح اور امریکہ کی واضح شکست ہے۔ طالبان نے اپنی بے پناہ جدوجہد سے ایک بہت بڑی طاقت کو شکست فاش دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ معاہدہ کب تک رہتا ہے تو یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس معاہدے کو خطرات تو بہت زیادہ لاحق ہیں لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ طالبان نے اپنے جذبہ ایمانی سے اٹھارہ سالہ طویل جدوجہد کے بعد امریکہ کو جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ طالبان کی یہ کامیابی کم نہیں ہے کہ انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں بغیر کسی بیرونی سہارے کے امریکہ کو بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس معاہدے کے بعد افغانوں میں پھر سے خانہ جنگی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ امریکہ طالبان سے واضح شکست کھا چکا ہے اور ہمیں طالبان کو یہ کریڈٹ دینا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

"ایکسپریس" نے نوجوان صحافیوں کو بہت مواقع دیئے، ایاز خان شریف النفس ایڈیٹر ہیں مجھے ہمیشہ سپورٹ کیا

پاکستان "ڈیزائن آف نیچر" کے تحت بنا ہے

پاکستان کے مستقبل کے متعلق میرا نقطہ نظر بڑا واضح ہے کہ اس دھرتی کا مستقبل روشن ہے۔(ان شاءاللہ) پاکستان ایک "ڈیزائن آف نیچر" کے تحت بنا ہے اور اس کے حالات جلد بہتر ہوں گے۔ ہر مشکل وقت میں اللہ نے غیب سے پاکستان کی مدد کی ہے۔ہمارے پروفیسر ہمایوں احسان صاحب کہتے ہیں کہ اس خطے میں جب بھی ہسٹری اَن فولڈ ہوتی ہے اور جب بھی کروٹ بدلتی ہے اس میں پاکستان کا اہم رول ہوتا ہے۔ چاہے وہ افغانستان میں روس کی شکست ہو یا طالبان کے ہاتھوں امریکہ کی شکست، اس میں پاکستان کا اہم کردار ہوتا ہے۔فوج کے سیاسی کردار کے متعلق میرا نقطہ نظر ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

پالیسیوں کے تسلسل میں اسٹیبلشمنٹ کا کردار

میں اسٹیبلشمنٹ کو ایک حقیقت سمجھتا ہوں کیونکہ دنیا بھر میں اس کا وجود ہے، دراصل اسٹیبلشمنٹ پالیسیوں کے تسلسل کی علامت ہوتی ہے۔امریکہ، انڈیا، انگلینڈ ہر جگہ یہی بات دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں کہ گزشتہ پچاس سال سے پاکستان کے چین کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں اور اس میں تسلسل رہا ہے چاہے بھٹو کی حکومت تھی یا ضیاء الحق، ایوب خان، نواز، زرداری اور عمران خان کی۔ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات کبھی خراب نہیں ہوئے، اس لیے کہ یہ تعلقات اسٹیبلشمنٹ ہی کے استوار کردہ ہیں۔یہی صورتحال ہماری سعودی عرب اور ایران کے ساتھ بھی ہے۔عراق ایران جنگ میں پوری عرب دنیا عراق کے ساتھ تھی اور پاکستان پر دباؤ تھا کہ عراق کا ساتھ دیا جائے لیکن پاکستان ایران کے خلاف نہیں گیا۔یمن کے مسئلے پر بھی یہی رہا کہ پاکستان نے اینٹی ایران سٹانس سے گریز کیا، یہ تسلسل اسٹیبلشمنٹ کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ اسٹیبلشمنٹ کو پیچھے رہ کر کام کرنا چاہیے اور اپنے گروپ اور اپنی سیاسی جماعتیں نہیں لانچ کرنی چاہئیں۔ پالیٹکس نہیں کرنی چاہیے اس سے ملک کو نقصان ہوتا ہے اسٹیبلشمنٹ کنٹروورشل ہو جاتی ہے۔اسے اپنے گروپس اور اپنے چکروں میں پالیٹکس نہیں کرنی چاہیے۔میں بہت پرامید ہوں کہ وطن عزیز کے حالات بہتر ہوں گے اور تعمیر و ترقی کی منازل طے کرے گا۔پاکستان میری محبت ہے اور یہ محبت مرتے دم تک قائم رہے گی۔ان شاء اللہ

میں "نیشنلسٹ" ہوں

پاکستانی فوج کے متعلق عرض کردوں کہ میں ایک پروپاکستان اور "نیشنلسٹ" ہوں۔میں پاکستان اور مسلم امہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔پاکستان اسلام کا ایک قلعہ ہے۔پاکستان کی مضبوطی اسلام ہی کی مضبوطی ہے۔پاکستان کے مفادات اور اسلامی

Scanned with CamScanner

دنیا کے مفادات ہم آہنگ ہیں۔ میں پاکستانی فوج کا زبردست حامی ہوں اور سمجھتا ہوں کہ فوج ہی اس ملک کی حفاظت کرنا جانتی ہے اور فوج نے بے پناہ قربانیوں سے یہ ثابت بھی کیا ہے۔ جہاں بھی پاکستان کی سلامتی اور سیکورٹی ایشوز کا مسئلہ آئے گا میں ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ اور فوج کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ میں پاکستانی فوج کے ''سٹریٹجک ڈیپتھ'' کو سپورٹ کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں اسے غلط سمجھا جاتا ہے، اس کا خواہ مخواہ تمسخر اڑایا جاتا ہے حالانکہ پاکستان کی سٹریٹیجک ڈیپتھ تھیوری جوابی ہے، یہ افغانستان میں بھارتی سٹریٹجک ڈیپتھ پیدا کرنے کی کوششوں کا جواب ہے۔ میں پاکستان کی نیوکلیئر پالیسی اور نیوکلیئر پروگرام کا زبردست حامی ہوں۔ سمارٹ بم اور جدید وپین بنانے کا حامی ہوں اور اس خطے میں ''انڈین Hegemony'' کے خلاف جو پاکستانی فوج جدوجہد کر رہی ہے، یہ بلاشبہ بہت ہی اہم ہے۔ فوج کے سیاسی کردار کے سوا اس کے ہر رول کو ہم سپورٹ کرتے ہیں۔

ایران نے ہمارے ساتھ سخت ڈیل کی

میں کہتا ہوں کہ ہمیں چین، ایران، سعودی عرب سمیت تمام عالمی برادری کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرنے چاہئیں لیکن سب سے پہلے اپنے قومی مفادات کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ہمیں بے وقوف بالکل نہیں بننا چاہیے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ایک مشہور قول ہے کہ ''ہم دھوکے کی ہزاروں صورتوں سے واقف ہیں لیکن ہم دھوکہ نہیں دیتے''۔ ہمیں بھی دوسروں کو دھوکا نہیں دینا چاہیے لیکن خود کو دھوکے سے بچانا تو چاہیے۔ چین ہمارا دوست ہے لیکن اس کے ساتھ معاہدوں میں بے وقوف نہیں بننا چاہیے اور ان کے مفادات کے لیے خود کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ اب دیکھیں کہ ایران بہت برے حالات میں گھرا ہوا تھا۔ اس پر بہت سی پابندیاں تھیں، عالمی دباؤ تھا اور اس کی گیس کا کوئی بھی خریدار نہیں تھا۔ اس نے ہماری ساتھ گیس کی ڈیل کی ہے اور ان حالات کے باوجود انتہائی سخت ڈیل کی ہے جبکہ تاپی گیس معاہدہ ہمیں ایران معاہدے سے 10 فیصد سستا پڑا ہے۔ ایران نے اتنے سخت حالات کے باوجود بھی پاکستان کے ساتھ معمولی نکے کی بھی رعایت نہ کی اور اپنے مفادات کو عزیز رکھا۔ تو ہمیں بھی اپنے معاملات ویسے ہی چلانے چاہئیں۔ براہ کرم میری اس بات کو شیعہ سنی کے تناظر میں نہ دیکھیں، میں نے پاکستانی ہو کر بات کی ہے، ان معاملات پر غور کرنے والا پاکستانی شیعہ بھی یہی بات کرے گا۔

عالمی شہرت یافتہ ''ٹونی بیوزان'' Tony Buzan سے ملاقات

عالمی شہرت یافتہ موٹیویشنل سپیکر ٹونی بیوزان سے ملاقات بھی میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ لاہور میں منعقدہ ایک سیمینار میں ٹونی نے پانچ گھنٹے تک اپنے نظریات اور تجربات شیئر کیے تھے۔ لاہور میں ایک سیمینار ہال میں آفیشل قسم کے سوٹ میں ملبوس سی ای اوز اور دیگر ٹاپ ایگزیکٹوز کے درمیان ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز میں ملبوس یہ اخبار نویس یقیناً عجیب اور مختلف نظر آ رہا تھا لیکن یہ دیکھنے اور سوچنے کا یارا کسے تھا؟ ٹونی بیوزان کی گفتگو کے جادو نے ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ حیرت سے منہ کھولے، ہر ایک گورے بابے کو دیکھتا تھا جس کی حیران کن کمیونیکیشن نے سب کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ مائنڈ میپ تکنیک کے اس بانی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سلطان لاکھانی اردو صحافیوں کے محسن ہیں

کارکن صحافی انہی کی وجہ سے خوشحال ہوئے، انہیں سہولتیں ملیں

نے دنیا بھر میں مائنڈ لٹریسی، کری ایٹو تھنکنگ اور سپیڈ ریڈنگ کے نئے دور کا آغاز کیا۔

تہتر سالہ ٹونی بیوزان کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ ان کی وجہ شہرت انسانی دماغ کو زیادہ سے زیادہ بہتر انداز میں استعمال کرنے کے لئے ان کی وضع کردہ تکنیکس اور میتھڈز ہیں۔ ٹونی نے وہ شہرہ آفاق مائنڈ میپنگ کی تکنیک دریافت کی جس نے مغربی دنیا کے ٹاپ کے تعلیمی اداروں، ملٹی نیشنل کارپوریشنز اور اہل دانش میں دھوم مچا رکھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چار سو سال پہلے اطالوی جینئس لیونارڈو جسے ان کی شہرہ آفاق تصویر مونالیزا کی وجہ سے شہرت ملی وہ بھی مائنڈ میپ کا طریقہ استعمال کرتے تھے۔ ٹونی بیوزان نے نہ صرف اس طریقہ کو باقاعدہ علم بنایا، سائنسی شکل دی بلکہ انسانی دماغ پر ریسرچ کر کے تخلیقی صلاحیت کو بہتر انداز میں استعمال کرنے کے طریقے ایجاد کیے۔ ٹونی بیوزان کے مائنڈ میپ نے بل گیٹس جیسے کارپوریٹ کنگ سے لے کر آئی بی ایم، جنرل موٹرز، بڑے بڑے بینکوں اور ہاورڈ، آکسفورڈ جیسی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور دانشوروں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ بل گیٹس نے کہا تھا کہ مائنڈ میپنگ کرنے والے ہی ہماری انفارمیشن ٹیکنالوجی کو اگلی سٹیج پر لے جا رہے ہیں۔

ٹونی بیوزان 140 سے زائد کتابوں کا مصنف ہے۔ دنیا کی چالیس زبانوں میں ان کی کتابوں کے تراجم فروخت ہو چکے ہیں۔ مائنڈ میپنگ ان کا مرکزی کام تھا لیکن میموری اور سپیڈ ریڈنگ پر بھی ان کے کام کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ ان کی سب سے پہلی کتاب یوز یور ہیڈ (Use Your Head) اکتالیس سال قبل شائع ہوئی تھی۔ اس نشست میں ایک ایگزیکٹو نے ٹونی بزن سے سوال کیا کہ ہمیں ٹائم مینجمنٹ کے حوالے سے کوئی مشورہ دیں۔ بوڑھے ٹونی بزن نے مسکرا کر جواب دیا کہ وقت تو ہزاروں سال سے یہیں پر ہے، ہمیشہ رہے گا۔ وقت کی مینجمنٹ کی فکر چھوڑیں وقت اپنے آپ کو خود ہی دیکھ لے گا۔ آپ اپنے دماغ کی مینجمنٹ کریں۔ جب اپنے دماغ کو درست انداز میں استعمال کرنا، نئے طریقے سے سوچنا شروع کر دیں گے تو باقی تمام مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

صحافت کو دربار نہیں ہونا چاہیے

میں چونکہ 25 برس سے صحافت سے وابستہ ہوں تو ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عنوان پر بھی اپنے کچھ خیالات کا اظہار کروں۔ میرا خیال ہے کہ ایک صحافی کو "دربار" سے وابستہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے اور ایک صحافی کو کسی قسم کا سرکاری عہدہ بھی نہیں لینا چاہیے۔ صحافی کا تعلق عوام کے ساتھ ہے اور وہ عوامی مسائل پر آواز اٹھاتے ہیں۔ وہ عوام کے ترجمان ہیں۔ صحافی کا کام یہ ہے کہ دربار کی طرف سے منہ پھیر کر عوام کی طرف منہ کر لے۔ استقامت سے کام لینا چاہیے۔ صحافت میں مشکل وقت آتا رہتا ہے اور انسان استقامت سے کام لے اور اللہ پر یقین رکھے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تو وقت کٹ جاتا ہے۔ایک وقت تھا کہ لاہور شہر میں میرے پاس موٹر سائیکل بھی نہیں تھی اور میں بسوں، ویگنوں پر دھکے کھاتا تھا۔دو دو میل پیدل چلا کرتا تھا۔ اب اللہ کریم نے سب چیزیں بہتر کر دی ہیں اور الحمدللہ رزق حلال سے بہتر کی ہیں۔رزق حلال کا مزہ ہی کچھ اور ہے ۔ میں تین بڑے میڈیا گروپس (ایکسپریس۔دنیا۔92نیوز) کی بانی ٹیم کا اہم حصہ رہا ہوں۔جنگ اخبار میں بھی کام کیا۔ جب آپ ایک سینئر صحافی کے طور پر تسلیم کر لیے جاتے ہیں تو پھر آپ کے پاس مختلف مواقع آتے ہیں، ترغیبات آتی رہتی ہیں۔ہم تعلقات بھی بنا سکتے ہیں اور خود کو کیش کروا سکتے ہیں لیکن اپنے ضمیر کا اعتماد اور سکون ختم ہو جاتا ہے۔اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کوئی ایک بھی بندہ ایسا نہیں ہے جو میری طرف انگلی اٹھا سکے اور میرے کریکٹر پر بات کر سکے۔اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔کوئی بھی سیاست دان اور سیاسی پارٹی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی ہے کہ ہم نے اس کو نوازا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک مشہور تابعی بزرگ حرم شریف میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے تھے۔اس وقت کے خلیفہ آئے اور وہاں ان کے پاس بیٹھ گئے، وہ بزرگ اسی بے نیازی سے بیٹھے رہے ،خلیفہ کے ایک وزیر نے ان سے کہا کہ امیر المومنین سامنے تشریف فرما ہیں اور آپ اسی طرح ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہیں تو اس پر انہوں نے بڑا ہی زبردست جواب دیا: ''ہاں میں ٹانگیں پھیلا سکتا ہوں کیونکہ میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ رکھے ہیں''۔جب آپ اپنے ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں اور کسی کے آگے نہیں پھیلاتے تو آپ بادشاہ بن جاتے ہیں۔مجھے آج تک کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ میں وزیروں مشیروں اور بیوروکریٹس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے اور وہی اپنے خزانوں سے دے رہا ہے۔

درباری صحافیوں نے ہماری صحافت کو بدنام کیا ہے۔یہ صحافی سیاسی جماعتوں کے پے رول پر ہیں اور انہی کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ چودھریوں، شریفوں وغیرہ کے اپنے صحافی ہیں جو ان کی ناز برداری کرتے ہیں۔تحریک انصاف کے اردگرد بھی ایسے صحافی ہیں جو کچھ حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔میں نوجوان صحافیوں سے کہنا چاہوں گا وہ یہ بات اپنے دل میں بسا لیں کہ جو وہ چاہتے ہیں اللہ ان کو ضرور دے گا لیکن اپنے صحافتی کردار کو داغ دار نہ کریں۔ میں نے فوج کی ہمیشہ حمایت کی ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی بھی فوجی عہدیدار اور آئی ایس پی آر کے قریب نہیں گیا۔آئی ایس پی آر کے کسی دفتر کا وزٹ تک نہیں کیا۔اگر مجھے کوئی بلاتا بھی ہے تو میں خود گریز کرتا ہوں۔ میں اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ میں جو چاہوں لکھوں اور آزادانہ تجزیہ کروں۔جب آپ کسی کے قریب ہو جاتے ہیں تو پھر غیر جانبدارانہ تجزیہ نہیں کر پاتے۔

الیکٹرانک میڈیا پر جانے کی کوشش نہیں کی

صحافت کے میڈیم کی بات کی جائے تو مجھے پرنٹ میڈیا پسند ہے اور مجھے نیوز چینلز پسند نہیں۔ٹی وی جرنلزم میں سٹریس بہت زیادہ ہے۔پرنٹ میڈیا میں تو پھر بھی گرین لائٹ آجاتی ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا میں صرف ''ریڈ لائٹ'' یا زیادہ سے زیادہ ییلو لائٹ ہے۔وہاں پر مسلسل پریشر اور سٹریس رہتا ہے۔میرے نزدیک ٹی وی جرنل ازم معیاری جرنل

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میاں عامر محمود کا رویہ ہمیشہ شفیق رہا
پانچ سال میں ایک بار بھی سخت بات نہیں
کی، ہمیشہ تکریم دی

ازم بھی نہیں ہے۔ بریکنگ نیوز کلچر کا تو میں سخت مخالف ہوں۔ سنسنی پھیلانا اور کسی کے پیچھے پڑ جانا یہ صحافت نہیں کچھ اور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ٹی وی چینلز ایک عفریت بن چکے ہیں۔ یہ ایک مونسٹر ہیں جن کو ہر لمحے ''راتب'' چاہیے اور گوشت چاہیے۔ ان کا کام لوگوں کا خون پی کر اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنا پڑتی ہے اور جب آپ بھی اسی کا حصہ ہوں گے تو آپ کو یہ سب کام کرنا پڑیں گے ورنہ آپ جلد ہی آؤٹ ہو جائیں گے۔

پرنٹ میڈیا میں مسائل تو بہت زیادہ ہے۔ یہ بہت جلدی تو ختم نہیں ہوگا لیکن اسے شدید خطرات بہر حال لاحق ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے پرنٹ میڈیا میں اب تخلیقی صحافی نہیں رہے۔ اخبار کو جس انداز سے ایک نئے دور میں ڈھالنا چاہیے وہ آج تک نہیں ہو سکا۔ اخبارات کو پرانے ہی انداز میں چلایا جا رہا ہے۔ وہی بیانات کا انداز اور اسی قدیم انداز کی خبریں۔ ہم نے اپنے اخبار میں کوشش کی ہے کہ اس میں سوشل میڈیا پر اچھا لکھنے والوں اور بلاگرز کو شامل کیا جائے۔ اخباری صحافت کو بچانا ہے تو اس میں آپ کو نیا خون شامل کرنا پڑے گا اور اداراتی صفحات کا مزاج تبدیل کرنا پڑے گا، سٹائل بدلنا ہوگا۔ روایتی صحافیوں کی بجائے نئے لوگوں کو آگے لانا ہوگا، خواتین کو موقع ملنا چاہیے۔ سوشل میڈیا کو پرنٹ میڈیا کے ساتھ مکس کیا جائے، مگر سلیقے سے، یہ کام ہو تو پھر یہ بچ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبارات کے پریزینٹیشن سٹائل کو تبدیل کرنا ہوگا۔ خبروں کے سٹائل کو بدلیں اور زیادہ سے زیادہ تجزیے شامل کیے جائیں۔ اب تو جس دن اخبارات چھپتا ہے اس سے بہت پہلے ہی لوگوں تک خبریں پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ آپ انداز لگائیے کہ میرے جیسا بندہ جو کہ بچپن ہی سے اخبارات پڑھ رہا ہے، اب ایسا ہوتا ہے کہ اخبارات کی فائل بندھی رہ جاتی ہے اور اسے کھول کر دیکھ بھی نہیں پاتا اور مجھے معلومات کے حوالے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑا کیونکہ یہ تمام معلومات پہلے سے مجھ تک پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ جب لوگ انٹرنیٹ پر مفت اخبارات پڑھ لیتے ہیں تو وہ پرنٹ اخبار کیوں خریدیں گے۔

سوشل میڈیا۔ فائدہ بھی نقصان بھی

سوشل میڈیا میں پوٹینشل تو بہت ہے لیکن گند میں بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ تمام فیک اکاؤنٹس بند کر دیے جائیں۔ سوشل میڈیا پر کسی کی عزت اچھالنا اور بکواسیات کا کلچر بہت عام ہے جس سے بہت الجھن ہوتی ہے اور اس کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا نے بہت سے لکھنے والے پیدا کیے ہیں اور لوگوں کو اپنی آواز بلند کرنے کا اختیار دیا ہے۔ سوشل میڈیا سے مین سٹریم میڈیا کی جو اجارہ داری تھی وہ اب ختم ہوگئی ہے۔ اگر کسی اہم اشو پر مین سٹریم میڈیا بائیکاٹ کرتا ہے تو وہ اشو سوشل

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میڈیا پر سب سے زیادہ ڈسکس کیا جاتا ہے۔اب تو حکومتوں کے لیے سفر شب بہت مشکل ہوگئی ہے۔ سوشل میڈیا پر منفی چیزیں بھی بہت ہیں لیکن مثبت چیزیں بھی ہیں۔

میری مطالعاتی زندگی

میں اپنے مطالعہ کے حوالے سے پہلے بھی ایک کتاب میں ذکر کر چکا ہوں۔قومی ڈائجسٹ کے قارئین کے ذوق کے لیے بتاتا چلوں کہ میری مطالعاتی زندگی کا پس منظر یہ ہے کہ میرے والد صاحب چونکہ۔انتہائی وسیع النظر مذہبی خیالات رکھنے والے انسان تھے اور ان کے پاس ایک وسیع لائبریری موجود تھی جس سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔میری مطالعاتی زندگی کی ابتدا کچھ اس طرح سے ہوئی کہ دوسری یا تیسری جماعت میں تھا، میرے بازو میں فریکچر ہوگیا اور میں بستر پر آپڑا، وقت گزاری کے لیے مجھے والد صاحب نے عمرو عیار اور ٹارزن کی کہانیاں لا کر دیں۔میں دو ماہ تک یہ کہانیاں پڑھتا رہا۔سامری جادوگر، چلوسک ملوسک کی کہانیاں، اس کے بعد کرائے کی کہانیوں کی دکان نے تسکین ذوق کا سامان کیا۔جہاں سے مجھے طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ مل گئیں یہ فیروز سنز کی شائع کردہ چھوٹی چھوٹی کتب تھیں اور میں ان سے واقف ہوا۔اگرچہ ذرا بڑی عمر میں، میں نے داستان اور طلسم ہوش ربا کی بڑی کتابیں بھی پڑھیں لیکن واقفیت کا آغاز ادھر ہی سے ہوا اس کے کرداروں میں بہت دل چسپی پیدا ہوگئی تھی، لندھور پہلوان کا کردار جو 7 من وزن کا گرز زمین پر اچھالتا ہے اور عمرو عیار کا کردار، اس کے بعد عمران سیریز کا دور ہے، ابن صفی اور مظہر کلیم ایم اے، ان کو بہت دل چسپی کے ساتھ پڑھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے میرے اندر نیشنل ازم کا جذبہ پیدا کیا۔ان کے یہ کردار جس طرح ملک کی محبت میں دشمن ملک کو ہدف بنائے اور ان کی سازشوں کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں وہ جذبہ حب الوطنی کے لیے بہت مفید اثرات پیدا کرتا ہے کچھ حوالوں سے مجھے مظہر کلیم ایم اے پسند آئے۔ انھوں نے کچھ نئے کردار بھی ڈالے جیسے جوانا، ٹائیگر، کیپٹن شکیل۔ان کرداروں نے مظہر کلیم کی تحریروں میں زیادہ دل چسپی بڑھائی۔ابن صفی کی کرنل فریدی عمران سیریز سے زیادہ دل چسپ ہے۔وہ خود بھی اس کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ابن صفی کی نثر زیادہ اچھی ہے۔مظہر کلیم میں Thrill زیادہ ہے اور ابن صفی میں سسپنس زیادہ ہے۔اس دور میں بچوں کے نامور مصنف اشتیاق احمد کی کامران اور انسپکٹر جمشید سیریز بھی میرے لیے متاثر کن رہیں۔

سکول کے زمانے ہی میں مجھے ڈائجسٹوں سے بھی واسطہ پڑ گیا تھا خصوصاً سب رنگ ڈائجسٹ، جس نے معیاری ادب کا چسکا پیدا کیا جو بعد میں افسانہ اور ناول پڑھنے کا سبب بن گیا۔اس دور کی ایک اہم دل چسپی تاریخ اسلام تھی۔ جب میں ساتویں جماعت میں تھا۔ کچھ نصاب سے متعلق کتابیں ہاتھ آگئیں۔ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ نام، واقعات سب یاد ہوگئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس دوران میرے ماموں امین ترین جن کا ذکر کر چکا ہوں انگریزی صحافت میں ان کا بڑا نام تھا، ان کی وفات پر نوائے وقت نے تعزیتی شذرہ بھی لکھا تھا، وہ احمد پور آئے، والد صاحب نے میری تعریف کی کہ اس کو تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔انھوں نے برامکہ کے زوال کے اسباب پوچھے۔انہیں شاید لگتا ہوگا کہ اسے نہیں معلوم ہوگا۔ میں نے پوری کتاب رٹی ہوئی تھی۔نصابی کتب میں دیے گئے عروج وزوال کے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اردو ڈائجسٹ ایک اچھی نرسری ہے

وہاں بہت کچھ سیکھا، مگر آگے بڑھنے کے

لئے وہاں سے نکلنا پڑتا ہے

سب اسباب گنوادیے۔ وہ متاثر ہوئے اور میرا خیال ہے کچھ انعام وغیرہ بھی دیا۔ انہی دنوں تاریخ ہند بھی پڑھی، اس دور میں نسیم حجازی کے ناولوں سے واقف ہوا پھر باری باری سب پڑھ ڈالے۔ ''خاک اور خون'' سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس دوران ہی میں نے زندگی کی پہلی فلم بھی دیکھی جو حیدر علی پر بنائی گئی تھی، ٹیپو سلطان کا کردار بہت ہی متاثر کن تھا۔

نسیم حجازی اور عنایت اللہ

میں سمجھتا ہوں کہ ہر طالب علم اور نوجوان کو نسیم حجازی پڑھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں ان کے بارے میں جو پراپیگنڈا کیا جارہا ہے وہ مناسب نہیں۔ نسیم حجازی کے ناولوں میں حب الوطنی، مضبوط کردار اور ملک وقوم کے لیے کچھ کر گزارنے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ جذبات اور محبت کا خوب صورت تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی نثر بہت اعلیٰ ہے، انداز اور ابلاغ بہترین ہے۔ ان کے کردار مضبوط ہیں، بہادر، نڈر، پاکیزہ فطرت کے حامل نوجوان۔ ایسے کردار نوعمر لڑکوں کے رول ماڈل ہوتے ہیں، خاص کر طاقت اور بہادری اس عمر میں دل کو بھاتی ہے۔ محمد بن قاسم ہوں یا حیدر علی اور ٹیپو سلطان۔ یہ ہماری تاریخ کے جگمگاتے ستارے ہیں اور ہماری تاریخ کے یہ کردار اعلیٰ ظرف بھی ہیں۔ یہ کہا جاتا کہ نسیم حجازی کو پڑھنے سے شدت پسندی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، یہ بالکل ہی غلط ہے۔ فکشن سے شدت پسندی کبھی نہیں آتی۔ ویسے بھی دوسری زبانوں اور قوموں میں بھی تاریخی ناول موجود ہیں، سپرمین، ہرکولیس اور بھیم کے کردار ہندی اور مغربی ادب میں عام ملتے ہیں، ان پر فلمیں اور ٹی وی سیریلز بھی بن چکے ہیں۔ اگر ان سے شدت پسندی پیدا نہیں ہوتی تو نسیم حجازی کے ناولوں سے شدت پسندی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ مسئلہ ایک ہی ہے، ہمارے سیکولر، لبرل لکھاری نسیم حجازی کو نفرت کی حد تک اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور اس طرز زندگی کو پیش کیا ہے، جس سے انہیں چڑ ہے۔ ایسا لائف سٹائل جہاں اخلاقی ضابطوں کی پابندی لازمی ہو، ہمارے ان لبرل دوستوں کو سخت ناپسند ہے۔ نسیم حجازی بیچارے اسی لئے نشانہ ستم بنتے ہیں۔ اس کے بعد اس دور کے ایک اور توانا لکھاری عنایت اللہ تھے ان کے ناول بھی پڑھے۔ خصوصاً ''داستان ایمان فروشوں کی'' صلاح الدین ایوبی کا کردار اسلامی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش کردار ہے، جس کو سب اپنے پرائے نہ صرف مانتے ہیں بلکہ ان کی عظمت کردار کے معترف بھی ہیں، عنایت اللہ مرحوم نے بڑی عمدگی سے اسے اپنے ناول میں پیش کیا۔ محلہ اور گھریلو لائبریری کے ساتھ ساتھ خوش قسمتی سے ہمارے شہر میں بلدیہ کی ایک اچھی لائبریری بھی موجود ہے۔ مطالعہ کے ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نعمت ثابت ہوتی ہے۔ اور میں نے بھی اس سے خوب استفادہ کیا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسلامی فکر کا مطالعہ

والد صاحب کی لائبریری میں ستر کے عشرے کے چٹان، افریشیا اور اردو ڈائجسٹ کی فائلیں مل گئیں۔ چٹان میں شورش کی تحریروں نے سحر زدہ کر دیا تھا۔ اسی دوران میں سید قاسم محمود کے شاہکار اشاعتی سلسلہ سے واقف ہوا۔ ان کا ترجمہ قرآن شائع ہو رہا تھا، شاہکار ترجمہ قرآن میں ہر آیت کے عربی متن کے ساتھ مولانا فتح محمد جالندھریؒ کا لفظی ترجمہ، مولانا مودودیؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور علامہ عبداللہ یوسف علیؒ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا۔ اب تو وہ ترجمہ قرآن اکٹھا بھی دستیاب ہے، ان دنوں ماہانہ قسطوں میں شائع ہو رہا تھا۔ قرآن فہمی میں اس کا بڑا اچھا اثر مرتب ہوا، اور ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کا ذوق و شوق بھی بڑھا۔ انگریزی ترجمہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی، میٹرک کی سطح کے لڑکے کی جتنی سمجھ بوجھ ہو سکتی ہے، ظاہر ہے اسی حساب سے یہ سب ہوا۔

میٹرک کے بعد ہونے والی تعطیلات کے زمانے میں مجھے اسلامی فکر کو پڑھنے کا موقع ملا، والد صاحب کے پاس بھی اسلامی فکر کے حوالے سے اچھی کولیکشن تھی اور مسالک سے قطع نظر وہ ہر طبقہ فکر کی کتابیں اپنے پاس رکھتے تھے اور مطالعہ بھی کرتے تھے۔ ادھر سے مجھے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ''تاریخ دعوت و عزیمت'' پڑھنے کا موقع ملا، مولانا علی میاں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے آج تک کی اسلامی تاریخ اور فکر کو بہت احسن انداز میں قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے، اس کتاب کی بدولت حسن بصریؒ، ابوالحسن اشعریؒ، امام غزالیؒ، عبدالقادر جیلانیؒ اور برصغیر سے متعلق شخصیات خصوصاً حضرت مجددؒ الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی فکر اور کام سے واقفیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے ان تمام کے بارے لکھا اور پھر ان کی کتب کا جائزہ اور ان سے اقتباس اس طرح سے دیے ہیں کہ ان کی فکر اور نظریات کی پوری تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے، ساتھ ہی ان کی نثر بھی بہت عمدہ ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب جو مجھے اس وقت ملی وہ ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش'' تھی، جس نے مجھے جدید دنیائے اسلام میں غیر ملکی قبضہ اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مرعوبیت اور اس کے جواب میں اٹھنے والی تحریکوں سے متعارف کروایا۔ اس دوران شبلی نعمانیؒ کی سیرۃ النعمانؒ اور المامون وغیرہ بھی مطالعہ کیں۔ علامہ شبلی کی الفاروق برسوں بعد پڑھنے کا موقعہ ملا۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں خان آصف نے آئمہ اربعہ پر ایک طویل سلسلہ شروع کیا، بالخصوص امام ابوحنیفہؒ پر انھوں نے بہت تفصیل سے لکھا تھا، بہت اچھے آسان اور عام فہم اسلوب میں چاروں آئمہ کرام یعنی امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور اولیائے کرام کی زندگی کو انہوں نے بیان کیا۔ ایک شیعہ عالم ملا باقر مجلسی کی کتاب 14 ستارے جو کہ (شیعہ عقائد کے مطابق) 14 آئمہ معصومین پر تھی، وہ بھی ہاتھ لگی اور پڑھ ڈالی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس دوران مجھے قادیانی لٹریچر کی بھی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ لیکن اس پر مرزا صاحب کی تصویر نے بہت ہی منفی تاثر چھوڑا، میں تصویر دیکھ کر ہی متنفر ہو گیا، افکار پڑھنا تو دور کی بات ہے۔

تصوف کی کتابیں

مسلم فکر میں جو تصوف کا مقام اور کردار ہے اس

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

روزنامہ ''دنیا'' کے میگزین اور ایڈیشنز میں نئے تجربات کئے، وہاں سے بطور میگزین ایڈیٹر میری شناخت بنی

کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تصوف کی امہات الکتب خصوصاً کشف المحجوب، کشف القلوب وغیرہ پڑھیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا ذکر رہ گیا تھا، انکی فکر نے جدید مسلم تھاٹس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تصوف کی بات ہورہی تھی، جدید اسلوب میں سرفراز احمد شاہ صاحب کی بڑی اہم کتب ہیں۔ احمد رفیق اختر صاحب کا کام اہم ہے، ویسے تصوف کے ساتھ سیکولرازم کے خلاف انہوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔ میں پروفیسر صاحب کا مداح ہوں، مگر وہ تصوف کے روایتی نظام کے آدمی بھی نہیں ہیں اگرچہ صوفی ہیں۔ حضرت مجدد الفؒ ثانی اور نقش بندی سلسلہ پر ان کی تنقید غیر مناسب اور بلا جواز ہے۔

جہاں تک فکری تربیت اور شخصیات کے اثرات کی بات ہے تو میں کہوں گا ایک کتاب جس نے مجھ پر سینکڑوں کتابوں اور افکار کے دروازے کھول دیے وہ ستار طاہر کی کتاب ''دنیا کی سو عظیم کتابیں'' ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب، افکار، نظریات اور ادب کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو اس میں لکھنے سے رہ گئی ہو، ممکن ہے کہ علمی دنیا کے آدمی اس بات کو لائق توجہ وتبصرہ نہ سمجھیں لیکن میری نظر میں تو ایسی کتاب ہے کہ اس کا سستا ایڈیشن شائع کر کے ہر طالب علم کو دے دی جائے تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔ علم، معاشرہ اور ادب کی آپ کو اس میں قرآن پاک، بائبل، گیتا اور سقراط، افلاطون، ہومر، ابن خلدون سے لے کر شیکسپیئر، دوستوفسکی، ٹالسٹائی اور اقبال سب ملیں گے، ان کا تعارف ان کی کتابوں کے اقتباسات اور غرض کیا ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے۔

اسلامی فکر میں نظریہ ارتقاء

اسلامی فکر میں نظریہ ارتقاء اور دیگر کچھ حوالوں سے سید قاسم محمود صاحب سے بھی میں نے بہت استفادہ کیا۔ نظریہ ارتقاء پر ان کے انسائیکلوپیڈیا والے مضامین بہت اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے عبدالغفار عزیز صاحب نے سید قطب شہیدؒ کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' بھجوائی، اور میں نے اس کو بہت متاثر کن پایا۔ اسلوب دل نشیں، ادبی معیار بہت اعلیٰ، ایسے ہی طاہر القادری صاحب کا ترجمہ اس لحاظ سے بہت اچھا ہے کہ انھوں نے ترجمے میں کچھ رعائتوں کو ملحوظ خاطر رکھا، کسی آیت کی ایک سے زائد تعبیر وتشریح ملی تو یا کا لفظ لگا کر وہ سب دے دیئے گئے۔ یاد رہے کہ سیاسی اعتبار سے میں طاہر القادری صاحب کو ناپسند کرتا ہوں۔ اپنے ترجمہ قرآن میں انہوں نے اے رسول ﷺ کی جگہ اے حبیب مکرم ﷺ کا لفظ لکھا جو احترام اور محبت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ غامدی صاحب کا ترجمہ بھی پڑھا، ان کی فکر کا بغور مطالعہ کیا، غامدی صاحب شائستہ سکالر ہیں، اگرچہ ان کی بعض تعبیروں اور تفردات سے سخت اختلاف ہے۔ میں ترجمہ کے لیے عموماً مولانا مودودیؒ کا ترجمہ ہی پڑھتا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوں۔اس کے حواشی مجھے بہت پسند آئے۔

سید مودودی، ڈاکٹر حمید اللہ، وحید الدین خان، اصلاحی، ندوی

اگر آپ یہ کہیں کہ میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر کس قلم کار کا ہے تو یہ کہنا میرے لیے قدرے مشکل ہوگا کیوں کہ میں نے پڑھنے میں ہمیشہ کسی تعصب کو سامنے نہیں رکھا، بہت سی کتابوں اور فکر نے متاثر کیا لیکن کسی ایک کا اسیر نہ ہو سکا، مثلاً دینی فکر میں غامدی صاحب کے خیالات نے بہت چونکایا لیکن ان کے تصوف کے بارے خیالات بہت سخت اور کسی حد تک تعصب پر مبنی ہیں۔ان کے بعض علمی تفردات متنازع ہیں، انہوں نے امت کے مجموعی موقف سے ہٹ کر بعض جگہوں پر اپنا الگ ہی ڈول ڈالا۔ڈاکٹر حمید اللہ مجھے بہت پسند رہے ہیں، خطبات بہاولپور ان کا اہم کنٹری بیوشن ہے۔مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' نے چونکایا ضرور لیکن میرے خیال میں انھوں نے روایت سے انحراف نہیں کیا، بلکہ روایتی تصورات کو جدید انداز اور اسلوب میں پیش کر دیا ہے۔ان کا اسلوب بہت عمدہ ہے لیکن فکر روایتی ہی ہے۔تاہم سید مودودیؒ کی بعض آرا سے اختلاف کے باوجود مولانا کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔مولانا اصلاحی بھی متاثر کن سکالر ہیں۔ مولانا وحید الدین خان کی داعیانہ سوچ، اعراض کا نظریہ میرے نزدیک اہم ہے لیکن ان کا بھارتی تعصب اور تاریخ کا تجزیہ قابل توجہ نہیں ہے،۔ اسی طرح علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ پر ان کی تنقید بھی بلا جواز ہے۔ اہل دیوبند میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ بہت متاثر کن ہیں۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ کے شائستہ علمی انداز نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔اہل علم کو یہی اسلوب اپنانا چاہیے۔

اخوان المسلمون، احمد جاوید، فتح اللہ گولن، شرف الدین یحییٰ منیریؒ

اخوان المسلمون کا دعوتی پہلو پر لٹریچر بہت متاثر کن ہے۔پوسٹ ماڈرن ازم پر احمد جاوید صاحب کا مضمون بڑا اہم لگا۔ احمد جاوید صاحب تصنیف وتالیف کی طرف آتے تو کمال کر دیتے۔امین احسن اصلاحیؒ ذرا روایت سے ہٹ کر ہیں۔ مقالات فراہی اس سے بھی زیادہ اہم ہیں، ان دونوں نے میرے روایتی فکر کو کافی حد تک تبدیل بھی کیا اور خیالات میں وسعت بھی پیدا کی۔ برصغیر میں مسلم بنیاد پرستی کے افکار کی بنیاد حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے خیالات پر رکھی گئی ہے۔ان سے آگاہی کے لیے میں نے مکتوبات امام ربانی کا بھی مطالعہ کیا اور شرف الدین یحییٰ منیری صاحب کے مکتوبات صدی اور دوصدی بھی پڑھے۔ ''دین میں ترجیحات'' علامہ یوسف القرضاوی کی بڑی قابل ذکر کتاب ہے۔ فتح اللہ گولن کے بارے پروپیگنڈا ہو رہا ہے لیکن سیرۃ پر ان کی کتاب ''نور سرمدی'' بہت ہی اہم کتاب ہے۔

جعفر شاہ پھلواری، محمود احمد غازی، واصف، علامہ اسد

جعفر شاہ پھلواری ندوی کے مقالات بھی نئی فکر کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات بہت اچھے اور معلوماتی لگے، وسیع النظر اور کھلے دل کے ساتھ تعصب سے پاک گفت گو اور ان کا مطالعہ اب میری پہلی ترجیح ہے۔ واصف علی واصف کو بھی پڑھا۔ الفاظ کا چناؤ اور بیان بہت ہی عمدہ ہے۔ محمد

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

"جنگ" کے نیوز روم میں عثمان یوسف کہتے

سب ایڈیٹر کو علم دشمن ہونا چاہیے، ہم اپنی

لکھی تحریریں ان سے چھپاتے

کاظم صاحب مرحوم کا میں بڑا مداح ہوں، اگرچہ انہوں نے اپنی کتاب اخوان الصفا اور دوسرے مضامین میں ایک شاندار مضمون لکھ کر میرے محبوب مصنف خلیل جبران کا سب تاثر ختم کر دیا، اخوان الصفا پر ان کا مضمون اہم ہے۔اس طرح ان کی "عربی ادب کی تاریخ" اور "مسلم فلسفہ عہد بہ عہد" بھی بہترین کتابیں ہیں۔ کتابوں پر ان کے تبصرے بھی بہت اہم ہیں۔خورشید رضوی صاحب کی "عربی زبان و ادب کی تاریخ" بھی بڑی اہم کتاب ہے۔ علامہ محمد اسد کی تحریروں نے بھی میری فکری تربیت میں اپنا کردار ادا کیا ہے، خصوصاً "روڈ ٹو مکہ"! اقبال کے خطبات کو دوبارہ پڑھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔

اردو کے بڑے افسانہ نگار

اردو فکشن میں مجھے تقریباً ہر اہم افسانہ نگار کو پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ان کے مجموعے بھی پڑھے۔ میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کو اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔ بیدی کی بعض چیزیں حیران کن ہیں، مگر کہیں کہیں بیدی مجھے متاثر نہیں کر سکا۔ منٹو کو پڑھتے ہوئے کہیں پر بھی مایوسی کا احساس نہیں ہوتا۔ کرشن چندر میرے خیال میں اوور ریٹڈ افسانہ نگار ہیں، انہیں ترقی پسندوں نے اٹھانے کی کوشش کی مگر بات بنی نہیں۔ کرشن چندر نے اپنے فن کو نظریے پر قربان کر دیا اور بہت سی آورد قسم کی پروپیگنڈہ ٹائپ چیزیں لکھیں، ان کے ناول آج بالکل ہی غیر متعلق ہو چکے ہیں، کوئی ذکر ہی نہیں کرتا، کرشن چندر کے پاس بہرحال اچھے افسانے اب بھی موجود ہیں۔ عصمت کا بھی یہی حال ہے، فیمنسٹ رائٹرز جیسے کشور ناہید وغیرہ انہیں بلند کرنے کی جتنی کوششیں کریں، کامیاب نہیں ہو پائیں گی۔ قرۃ العین حیدر کا فن البتہ نہ ماننے والوں کو بھی مجبور کر دیتا ہے۔ جیلانی بانو کی بعض چیزیں اچھی لگیں۔ نئے لکھنے والی خواتین میں طاہرہ اقبال اچھی ہیں، نیلوفر اقبال کے بعض افسانے کمال کے ہیں۔ خالدہ حسین نے البتہ متاثر نہیں کیا۔ ممتاز مفتی کا آپا بڑا افسانہ ہے، مگر مجھے مفتی کا ناول زیادہ اچھا لگا، میری مراد "علی پور کا ایلی" سے ہے۔ اشفاق احمد کا خاص سٹائل ہے، آپ انہیں نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہی معاملہ انتظار حسین کے ساتھ ہے۔ میں ذاتی طور پر اسد محمد خان کو بھی ہائی ریٹ کرتا ہوں۔ سید رفیق حسین، ابوالفضل صدیقی کے جانوروں کے حوالے سے تحریریں بہت عمدہ ہیں۔ سب رنگ میں ایک ناولٹ پڑھا تھا، نمبردار کا نیلا، اس کے مصنف سید محمد اشرف ہیں، ان کا یہ ناولٹ کمال کا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے ان کا ناول "آخری سواریاں" پڑھا، اچھا لگا۔ بلونت سنگھ کی بعض چیزیں بھی کمال کی لگیں۔ منشا یاد کے افسانے مجھے اچھے لگے، اگرچہ میں علامتی افسانوں کا زیادہ مداح نہیں، مجھے کہانی ہی بھاتی ہے۔

میرے پسندیدہ ناول نگار

ناولوں کی طرف آئیں تو پہلے میں مستنصر حسین

Scanned with CamScanner

تارڑ کا نام لینا چاہوں گا۔ اگرچہ میرے پسندیدہ دس ناولوں کی فہرست میں تارڑ صاحب کے ناولوں سے پہلے اور نام بھی ہیں، مگر تارڑ کے سحر نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا۔ ہمارے نقادوں اور اردو ادب والوں نے اس کو بہت نظر انداز کیا ہے، ان کے سفرنامے کو اگر ہم زیر بحث نہ لائیں، تب بھی ناول نگار کے طور پر تارڑ ایک دیو ہے۔ فکشن کے ابتدائی طالب علموں کو میرا مشورہ ہے کہ ''پیار کا پہلا شہر'' سے آغاز کرنا چاہیے۔ یہ بڑا سویٹ سا میلوڈی رکھنے والا ناول ہے۔ تارڑ کے زیادہ بڑے ناول اگرچہ بہاؤ، راکھ، ''خس و خاشاک زمانے ہیں۔ ویسے تو قربت مرگ میں محبت کے ساتھ ڈاکیہ اور جولاہا بھی قیامت خیز ناول ہیں۔ اگر اردو کے دس بڑے ناولوں کی فہرست بنائی جائے تو میری رائے میں تارڑ کے ناول ''بہاؤ'' خس و خاشاک زمانے'' اور'' راکھ'' ضرور اس میں شامل ہوں گے۔ قرۃ العین حیدر بلاشبہ اردو کی بڑی ناول نگار ہیں'' آگ کا دریا'' جب پہلی دفعہ لائبریری سے جاری کروایا، پڑھ نہ سکا، بلکہ 15 منٹ بعد ہی جا کر واپس کر آیا تھا لیکن بعد میں پڑھا اور لطف بھی لیا۔ لیکن اس کی بجائے '' آخر شب کے ہم سفر'' نے زیادہ متاثر کیا۔ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اہم ہے، اگرچہ وہ خود'' باگھ'' کا بہت ذکر کرتے ہیں لیکن مجھے'' نادار لوگ'' باگھ سے زیادہ اچھا لگا۔ اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کا'' کئی چاند تھے سر آسماں'' اردو کے بڑے ناولوں میں سے ایک ہے اور قاری کو مدتوں تک یاد رہنے والا ہے۔ بانو قدسیہ نے ایک درجن سے زائد اوسط درجے سے بھی کم تر درجے کی کتابیں لکھیں لیکن ان کا ناول'' راجہ گدھ'' ایک بھرپور معنویت رکھنے والا کام ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کوئی ناول قابل ذکر نہیں ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا '' دشت سوس'' بھی بہت اہم ناول ہے۔ ہمارے ہاں اس کا تذکرہ زیادہ نہیں ملتا، ان کے جس ناول'' تلاش بہاراں'' کو آدم جی ادبی ایوارڈ ملا، وہ مجھے زیادہ پسند نہیں آیا۔'' علی پور کا ایلی'' اگرچہ سوانحی قسم کا ناول ہے لیکن بہت اچھا، اس کا ایک خاص ذائقہ ہے۔ نئے لکھنے والوں میں ایک قابل ذکر نام مرزا اطہر بیگ کا ہے، ان کا ناول'' غلام باغ'' قابل توجہ ہے، مرزا صاحب نے اردو ناول میں خاصے تجربے کئے ہیں، سائبر سپیس کا منشی دلچسپ ناول ہے، حسن کی صورتحال البتہ کچھ زیادہ تجرباتی ہے۔ عاصم بٹ کا ناول'' دائرہ'' اچھا ہے اگر اس میں غیر ضروری طور پر جنسی تلذذ پر مبنی چند مناظر حذف کر دیئے جائیں، ان کا دوسرا ناول بھید بھی دلچسپ ہے۔ خدیجہ مستور کے ناول آنگن کی تعریف بہت سنی لیکن مجھے اس نے متاثر نہیں کیا۔ یہ کسی نقاد کی رائے نہیں بلکہ ایک عام قاری کی حیثیت سے میری رائے ہے، آپ اس کو اہمیت دیں یا نہ دیں۔ میں ایک بار پھر تارڑ کا ذکر کروں گا اور ہر نئے پڑھنے والے کو مشورہ دوں گا ان کے ناول'' خس و خاشاک زمانے'' قربت مرگ میں محبت'' ڈاکیا اور جولاہا'' بہت مختلف انداز میں لکھے گئے طاقت ور اسلوب کے ناول ہیں۔ جس میں محبت اپنے طوفانی انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ تارڑ کو اردو نقادوں نے بے رحمی سے نظر انداز کیا ہے، کچھ قصور تو ان کے پبلشر کا بھی ہے جنھوں نے ان کتابوں کو عام قاری کی دسترس ہی میں نہیں آنے دیا۔ احمد بشیر کا سوانحی ناول بھی اہم ہے، اسے بھی ناقدین نے نظر انداز کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی
غلام عباس اور دیگر

افسانے کے بارے میں پہلے بات ہو چکی ہے۔ منٹو کا انداز بڑا تیکھا ہے۔ وہ فی الواقع ایک بڑا

Scanned with CamScanner

خاور نعیم ہاشمی تخلیقی نیوز ایڈیٹر تھے

وہ سازشی بھی نہیں رہے، ویلنٹائن ڈے کے تصور کو انہوں نے مقبول بنایا

افسانہ نگار ہے۔ لیکن فحاشی کا جو الزام ہے وہ تین چار افسانوں کی حد تک تو غلط نہیں، مثلاً بو جس نے پڑھا ہو، وہ اس میں منٹو کے بے حجاب اظہار کی کیا جسٹی فکیشن دے سکتا ہے! اس طرح تو خوشونت سنگھ کے کمپنی آف ویمن کو بھی ادبی شاہکار مان لیا جائے! منٹو مگر اردو کا سب سے ممتاز افسانہ نگار ہے۔ ایک زمانے میں اردو افسانہ کے 4 بڑے ستون کہے جاتے تھے منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر۔ عصمت کے افسانے اس لحاظ سے تو اہم ہیں کہ اس سماج میں جہاں پابندیاں زیادہ تھیں، عورتوں کے بارے انھوں نے کھلے اور جرات مندانہ افسانے لکھے اس کے علاوہ ان میں کچھ خاص نہیں۔ کرشن چندر تو ترقی پسند تحریک کی نذر ہو گئے، پروپیگنڈا ادب اور صحافت میرے نزدیک اچھی روایت نہیں ہے۔ کرشن چندر کے پاس کئی عمدہ افسانے ہیں، لیکن اگر وہ پلاننگ کر کے لکھے جانے والے ترقی پسند افسانوں کی طرف نہ جاتے تو شائد زیادہ بہتر کام دے جاتے۔ بیدی کی بعض چیزیں تو بے مثال ہیں، مگر اس سے کہیں زیادہ اوسط سے بھی کم درجے کی۔ میرے خیال میں غلام عباس کو اردو کے تین چار بڑے افسانہ نگاروں میں شامل کرنا چاہیے، ان کا کرافٹ غیر معمولی ہے۔ انتظار حسین بھی بڑے افسانہ نگار ہیں۔ زاہدہ حنا، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کا بھی معاملہ کرشن چندر والا ہو گیا ہے۔ یہ سب پراپیگنڈا ادب کے لکھاری ہیں، ان میں آورد زیادہ ہے۔ پہلے سے طے کر کے لکھا جاتا ہے۔

غیر معروف افسانہ نویس

افسانہ کے کچھ لکھاری جو بہت زیادہ معروف نہ ہو سکے ان میں قاضی عبدالستار، سید رفیق حسین بہت اہم ہیں ان کے افسانے بہت عمدہ ہیں۔ سید قاسم محمود کے کچھ افسانے بھی بہت کمال کے ہیں قاضی عبدالستار کا داراشکوہ پر ناولٹ بہت کمال کی چیز ہے۔ ابوالفضل صدیقی کا ''سرخا'' اور دوسرے افسانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ ہم نے صدیقی صاحب کو سب رنگ ہی میں پڑھا۔ احمد ندیم قاسمی بھی بڑے افسانہ نگار ہیں، تعداد کے اعتبار سے بہت اچھے افسانے قاسمی صاحب کے پاس موجود ہیں۔ انہیں نظر انداز کرنا تعصب ہی ہوگا۔ پنجاب کی معاشرت اور دیہی پس منظر میں بلونت سنگھ بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ جدید دور یعنی پچھلے بیس پچیس سال کے حوالے سے اسد محمد خان بہت اہم نام ہے۔ وہ آغاز سے ہی بہت کمال کی تحریریں لکھ رہے ہیں، جیسے ان کا پہلا افسانہ ''باسودے والی مریم'' بہت خوب صورت کہانی ہے۔ انتظار حسین ناول کی بجائے افسانہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ علامتی لکھنے والوں میں رشید امجد پاکستان کے حوالے سے سرخیل ہیں، ان کے بعض افسانے چونکا دینے والے ہیں۔ ویسے پچھلے دنوں ایک دوست کے ذریعے سریندر پرکاش کو پڑھنے کا موقعہ ملا، وہ غیر معمولی علامتی افسانہ نگار ہیں۔ منشایاد بھی مجھے اچھے لگے، نیر مسعود

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے علامتی افسانے بھی اچھے ہیں، مگر ان کا ''طاؤس چمن کی مینا'' شاندار افسانہ ہے۔ جیلانی بانو بھی اچھا لکھتی ہیں۔ نیلوفر اقبال کو سب رنگ ہی میں پڑھا، آنٹی اور کمفٹی وغیرہ ان کے ہلا دینے والے افسانے ہیں۔ بعض چیزیں مظہر الاسلام کی بھی اچھی ہیں۔ ایم الیاس عمدہ افسانہ نگار ہیں، انہیں ان کا اصل مقام نہیں ملا، اختر رضا سلیمی کا ناول جندر بھی اہم ہے، ان کا تذکرہ نہیں کر پایا، اس لئے افسانے ہی میں کر دیا۔ ایک زمانے میں واجدہ تبسم کو بھی پڑھا، مگر ان کے ہاں جنسی تلذذ زیادہ ہے، اگرچہ بعض تحریروں میں حیدرآباد دکن کی معاشرت اچھی بیان کی۔

آپ بیتی/سوانحی ادب

سوانحی ادب جس میں خاکے، آپ بیتی اور سوانح آتے ہیں۔ یہ بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس میں بہت کمال کی تحریریں لکھی گئی ہیں۔ خاکوں میں ایک شائل تو ہے ممتاز مفتی کا۔ اوکھے لوگ، انوکھے اولڑے وغیرہ۔ مفتی کمال کا فقرے باز ہے، ایسا کاٹ دار اور تیکھا انداز کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ احمد بشیر کے خاکوں کا مجموعہ جو ملے تھے راستے میں بہت پسند آیا۔ وجہ وہی صاف گوئی اور تیکھا اسلوب ہے۔ محمد طفیل نقوش کے خاکوں کا اپنا انداز تھا، جیسے مگر تفصیلی خاکے، مجبی وغیرہ۔ چند سال پہلے ملتان کے ڈاکٹر انوار احمد کے خاکوں کا مجموعہ پڑھا، دنگ رہ گیا۔ ایسی سفاکی کے ساتھ خاکہ لکھا جا سکتا ہے، کبھی سوچا نہیں تھا۔ بہت متاثر کن خاکے تھے۔

سوانحی ادب میں سب سے اہم گاندھی کی ''تلاش حق'' ایک متاثر کن کتاب ہے۔ نہرو کی ''تلاش ہند'' اور نیلسن منڈیلا کی آپ بیتی آبنگ اور جذبات سے بھرپور اور کچھ کر گزرنے کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ قائداعظم پر جتنی بھی کتب لکھی گئیں ان میں سٹینلے والپرٹ کی جناح ہی قابل ذکر کتاب ہے۔ اور یا نا فلاسی کے سوانحی اور خاکہ نما انٹرویو بھی بہت کمال کی چیز ہیں۔ اور پھر اسی طرز پر لکھی گئی ہمارے دوست جناب رؤف کلاسرا کی کتاب ''ایک سیاست کئی کہانیاں'' بھی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ عالمی ادب کے حوالے، دلکش اقوال اور ان کی ہمارے ملکی حالات پر تطبیق کے لحاظ سے روئیداد خان کی ''پاکستان انقلاب کے دہانے پر'' اہم کتاب ہے۔ ویسے تو میں فیروز خان نون کی ''چشم دید'' اور چوہدری محمد علی کی ''ظہور پاکستان'' بھی پڑھ چکا ہوں، ایوان صدر میں سولہ سال ایم بی خالد کی دلچسپ کہانی ہے جو ہمارے اولین دور اقتدار کے لوگوں کے کرداروں کو سامنے لاتی ہے اور شہاب نامہ کو تو ہم نظر انداز کر ہی نہیں سکتے، اس میں ادب، آپ بیتی اور تاریخ کا بیان بہت دل نشین انداز میں آ گیا ہے۔

ابوالکلام آزاد، محمد حسین آزاد

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو لڑکپن یا اوائل عمری میں بہت متاثر کرتی ہیں۔ ان میں بعض تو غیر معمولی نثر پارے تھے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر، تذکرہ وغیرہ۔ مولانا کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات بھی مجھے بہت اچھی لگی، دو تین بار پڑھی۔ بعض کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ایک زمانے میں پسند آئیں، بعد میں پڑھا تو حیرت ہوئی ہے کہ کس وجہ سے پسند آئی۔ ''یادوں کی برات'' مجھے ایک وقت بہت پسند آئی۔ بعد میں اپنے اوپر ہی حیرت ہوئی۔ اتنی مبالغہ آمیز اور غیر ضروری تفاخر سے بھری عشق بازی کے عامیانہ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حسن نثار کو یہ "اعزاز" حاصل ہے کہ وہ

ایک کالم دس ہزار بار لکھ چکے، کسی بھی سال کا کالم

پڑھ لیں، وہی ذائقہ ہوگا

جملوں والی کتاب کو آخر کیوں پسند کیا، پست اور گھٹیا جملے بولنے والوں کے ساتھ جوش کی دل چسپی حیرت انگیز ہے، ان کے نزدیک ہر فحش نگار اہم ہے۔

شبلی نعمانی، غالب، مختار مسعود

عمدہ نثر کے لحاظ سے شبلی نعمانی کی کتابیں اور خطوط غالب بھی بہت اہم ہیں۔ لیکن اردو نثر میں جس کتاب نے اپنے اسلوب کے اعتبار سے بہت متاثر کیا وہ مختار مسعود صاحب کی آواز دوست ہے، ان کی تیسری کتاب لوح ایام بھی بے مثال ہے لیکن "آواز دوست" ایسی کتاب ہے کہ آپ عمر کے جس حصہ میں اور جس کیفیت سے بھی پڑھیں گے آپ کے لطف کو دوبالا کردے گی۔ ان کے انتقال کے بعد شائع ہونے والی کتاب حرف شوق بھی کسی سے کم نہیں۔

طنز و مزاح

طنز و مزاح میں شفیق الرحمٰن کو پہلے پڑھا لیکن سب سے گہرا تاثر مشتاق احمد یوسفی ہی کا بنا۔ یوسفی صاحب کے بارے میں کیا عرض کیا جائے۔ چراغ تلے، زرگزشت، خاکم بدہن اور سب سے بڑھ کر آب گم، کمال کا لکھا انہوں نے۔ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ فقرے کی تراش خراش ان پر ختم ہے، اگرچہ کہیں پر آورد کا احساس بھی ہوتا ہے، آب گم میں چونکہ کہانی کا عنصر زیادہ ہے، اس لئے یہ زیادہ دلچسپ بھی لگی۔ ابن انشا اپنی بے ساختہ نثر کے باعث ہمیشہ اچھے لگے۔ اردو کی آخری کتاب، خمار گندم اور ان کے سفرنامے اوائل کالج کے زمانے ہی میں پڑھتے، بڑا لطف ملا۔ محمد خالد اختر اردو کے انڈر ریٹیڈ مزاح نگار ہیں۔ مجھے ان کی تحریریں اچھی لگیں، خاص کر "چاکی واڑہ میں وصال"۔ منے افق کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ، اگرچہ اس کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے لیکن یہ ایک قابل ذکر کتاب ہے۔ "چچا عبدالباقی کی کہانیاں" خالد اختر کا ایک خاص سٹائل ہے، وہ انگریزی میں سوچتے اور اسے اردو میں ڈھالتے ہیں، کہیں کہیں پر قاری چونکتا بھی ہے، مگر بعد میں وہ لطف لینے لگتا ہے۔ کرنل محمد خان کی "بجنگ آمد" اور "بزم آرائیاں" بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔

اردو کے کلاسیکل نثر نگار

اس کے علاوہ اگر ہم کچھ اردو کے کلاسیکل نثر نگاروں کا ذکر کریں تو میرے نزدیک محمد حسین آزاد کی آب حیات اور "نیرنگ خیال"، شاہد احمد دہلوی کی اجڑا دیار، ملا واحدی کی "دلی جو اک شہر تھا" اگر کسی کو خاص دلی کی زبان پڑھنے کا ذوق ہو تو فرحت اللہ بیگ کے مضمون "دلی کا آخری مشاعرہ" اور ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی پڑھے۔ دیوان سنگھ مفتون کی ناقابل فراموش کا ذکر کروں گا، اخلاق احمد دہلوی بھی بہت اچھی نثر لکھتے تھے۔ اس حوالے سے اشرف صبوحی کا نام نہ لینا ظلم کے مترادف ہوگا۔ صبوحی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

صاحب دلی والے تھے اور دلی کی زبان لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

انگریزی اور سرائیکی لٹریچر

اردو کے علاوہ کچھ کچھ انگریزی اور کسی حد تک سرائیکی لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ سرائیکی میں خواجہ غلام فریدؒ کا تو قلب و ذہن پر بہت گہرا اثر ہے۔ ان کی شاعری اور افکار بہت ہی اہم ہیں، ان کے علاوہ رفعت عباس اور ڈاکٹر اشولال فقیر جدید نظم اور غزل لکھنے میں بہت ممتاز و منفرد ہیں۔ شاکر شجاع آبادی پاپولر شاعروں میں آتے ہیں، مگر ان کے دوہڑے مجھے اچھے لگے۔ عبدالباسط بھٹی نے ''سانولے سلونے'' کے نام سے سرائیکی خاکے لکھے جو بلاشبہ بہت کمال کے ہیں۔ اگر ان کا اردو ترجمہ ہو تو اردو ادب میں بھی اچھا اضافہ ہوگا۔ سفیر لاشاری، ظفر لاشاری، اچھے ناول نگار ہیں۔ ناتھ جی سرائیکی کا بہت کمال ناول ہے۔ ملک عبداللہ عرفان نے لکھا ہے کہ اس کے بھی ترجمہ کی ضرورت ہے، احمد خان طارق کے دوہڑے بھی قاری پر گہرا تاثر مرتب کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں دلچسپی

شاعری میں غالب، اقبال، اور فیض کو ہی میں نے دل لگا کر پڑھا اور پسند کیا، منیر نیازی، ناصر کاظمی، اقبال ساجد اور ظفر اقبال اچھے شاعر ہیں۔ ظفر اقبال نے شاعری میں تجربات بہت کیے ہیں۔ ان کے ہاں ندرت خیال بھی ہے، اور نئے نئے تجربات بھی، لیکن ان کا پرابلم بسیار نویسی ہے، کاش کہ انھیں بھی کوئی فضل حق خیر آبادی مل جائے جو کہ ان کے کلام کو چھانٹ کر دیوان غالب کی طرح ایک بہترین مجموعہ کلام سامنے لانے اور ظفر صاحب غالب کی طرح اس کی بات مان بھی جائیں۔ میرے خیال میں ''انتخاب میر'' میں بھی ابھی اور انتخاب کی ضرورت اور گنجائش باقی ہے۔ اس کے علاوہ جوش شاعر اچھے تھے لیکن کچھ لابی ان کو چڑھانے اور زیر کرنے کے لیے سرگرم بھی رہی ہیں۔ جس طرح جوش صاحب کو چڑھانے کے لیے کراچی میں ایک لابی موجود تھی اس نے فیض صاحب کے مقابلے میں جوش کو لانے کی کوشش کی اور کچھ اسلامی فکر کے لوگوں نے بھی لیکن فیض کو پیچھے نہیں دھکیلا جا سکا۔ مجید امجد، ن م راشد، احمد جاوید کی نظم بہت پاورفل ہے، نثری شاعری میں ذی شان ساحل کا کوئی جواب نہیں ہے۔ نثری نظم میں افضال احمد سید قابل ذکر لگے۔

انگلش لٹریچر

انگریزی میں گاڈ فادر بہت پسند آیا۔ فلم سے ناول زیادہ مزے دار لگا۔ سڈنی شیلڈن، اگاتھا کرسٹی، چارلس ڈکنز، پاؤلو کوئیلو کا الکیمسٹ، ڈی ایچ لارنس کے ناول، موسپاں کی کہانیاں اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں پڑھیں، خشونت سنگھ کے ناول جیسے Train to Pakistan، ''دلی'' بھی پڑھے۔ اس کے علاوہ دو اہم کتب inside Russia, Inside America بہت پسند آئیں۔ شیر باز مزاری کی آپ بیتی بھی بہت توجہ کے ساتھ پڑھی، بھٹو کی آپ بیتی بھی شاعرانہ طرز کی نثر ہے۔ عالمی ادب کی کچھ چیزیں انگریزی میں مگر زیادہ تر تراجم پڑھے۔ بڑے ناولوں میں تو ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس، دوستوفسکی کے برادرز کراماز وف، کرائم اینڈ پنشمنٹ کا نام لوں گا۔ گارشیا مارکیز نے مجھے بہت متاثر کیا۔ تنہائی کے سو سال، وبا کے دنوں

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

خلیل ملک اچھا لکھتے تھے، مگر بطور کالم نگار

وہ انڈر ریٹڈ رہے، حب جاہ کے باعث

وہ اپنا اصل مقام نہ پا سکے

میں محبت، ایک پیش گفتہ موت کی روداد وغیرہ کمال کے ناول ہیں۔ اور حان پاموک بھی حیران کن ہیں، مائی نیم از ریڈ، وائیٹ کیسل پڑھے، ابھی تک ان کے سحر سے باہر نہیں آ سکا۔ حوزے سارو گوما کے ناول کا ترجمہ اندھے لوگ پڑھا۔ حیرت ہوئی کہ ایسے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ میلان کنڈیرا کے تجربات نے بھی چونکایا ہے۔ عالمی ادب کا میرا مطالعہ محدود ہی ہے اور زیادہ تر تراجم کی مرہون منت۔ ترجمے میں ظاہر ہے اصل والی بات بالکل نہیں ہوتی، مگر نہ ہونے سے کچھ نہ کچھ ہونا بہتر ہی ہے۔

میری اہلیہ سعدیہ مسعود

میرے کالم نویسی کے سفر میں اگرچہ دیر سے شامل ہوئی، مگر اس کا حصہ بہت اہم اور مرکزی ہے، وہ ہیں میری اہلیہ سعدیہ مسعود۔ سعدیہ کے غیر معمولی تعاون اور غیر مشروط، غیر متزلزل سپورٹ کے بغیر میری زندگی کبھی اتنی خوبصورت نہ ہو پاتی۔ کالموں کا انتخاب بھی شاید کبھی نہ ہو پاتا اور نہ ہی کچھ اور ممکن ہوتا۔ میں نے زندگی کا ایک حصہ کڑی مشکل میں گزارا ہے، اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، پھر بھی کئی بار ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچتا، بقول یار طرح دار کرامت بھٹی میرے کئی سال گویا ریزر ایج (چاقو کی دھار) پر گزرے۔ مجھے لگتا ہے کہ صحافت اور زندگی کے دیگر کٹھن لمحات کو صبر سے کاٹنے کا اجر مجھے اپنی اہلیہ سعدیہ مسعود کی صورت میں ملا۔ اس نے زندگی میں محبتوں کے پھول کھلانے

ہیں۔ سعدیہ کے والد افضل مسعود ایڈووکیٹ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ سرائیکی کے ممتاز قوم پرست رہنما اور ادیب تھے۔ پاکستان سرائیکی پارٹی کے بانی لیڈروں اور بیرسٹر تاج لنگاہ کے انتہائی قریبی ساتھی۔ سرائیکی پڑھنے، لکھنے اور بولنے کے وہ پرجوش حامی تھے۔ انہوں نے خوشونت سنگھ کے ناول ٹرین ٹو پاکستان کا سرائیکی میں ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کتاب ناچ گھر اور جی ایم سید کی ایک کتاب کو بھی سرائیکی میں منتقل کیا تھا۔ عام قوم پرستوں کے برعکس افضل مسعود صاحب نہایت متحمل مزاج اور اختلاف برداشت کرنے والے انسان تھے۔ ان سے میری گھنٹوں بحث ہوتی، مگر وہ مسکراتے رہتے، کبھی بات کو تلخی کی جانب نہیں جانے دیا۔ یہی وصف سعدیہ میں بھی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا اسے شروع سے شوق رہا، شادی سے پہلے میرے کالم پڑھتی تھی اور بقول اس کے میرا مثبت انداز اور رجائیت پسندی اچھی لگتی تھی۔ سعدیہ میرے کالم چھپنے سے پہلے پڑھتی ہے اور مصیبت یہ ہے کہ وہ تحریر اور قلم کے میدان میں رعایت کی زیادہ قائل نہیں۔ جو کالم اسے پسند نہیں آتا، صاف کہہ دیتی ہے کہ آج مزا نہیں آیا یا آج آپ کا استدلال مضبوط نہیں تھا۔ جو اچھے لگیں، ان کی ستائش بھی کرتی ہے۔ خود اس کا بھی کئی سال میڈیا سے تعلق رہا۔ سرائیکی ٹی وی چینل روہی میں بطور پروڈیوسر کام کیا، ریڈیو پاکستان

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

میں بطور ایف ایم اینکر، ریسرچر کے باقاعدہ کام کیا، سرائیکی اور اردو شو چلاتی رہی۔ اس کی تحریر میں بڑی جان ہے، خاص کر جزیات بنی کمال کی ہے، مگر بچہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے لکھنے پر توجہ نہیں، اگرچہ میرا اس کے ساتھ وعدہ ہے کہ ان شاء اللہ ہم دونوں مشترکہ طور پر ایک ناول لکھیں گے۔ کب ایسا ہو پائے گا، یہ قدرت کی مہربانی پر منحصر ہے۔ اپنے چاروں بچوں، بیٹی لائبہ خاکوانی، بیٹوں صارم (پہلے اس کا نام عرصم تھا) خاکوانی، معز خاکوانی اور سات سالہ عبداللہ خاکوانی کا میرے کالموں میں حصہ ابھی تک کالم میں میری تصویر دیکھنے کی حد تک ہی ہے۔ بیٹی اب اپنی پسند کا کوئی کالم پڑھ لیتی ہے، منجھلے بیٹے معز کو تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی، ارطغرل ڈرامہ دیکھ دیکھ کر وہ ترک تاریخ، منگول تاریخ وغیرہ میں دلچسپی لیتا ہے اور کتابیں بھی پڑھنے لگا ہے۔ بچوں کا کالم والا صفحہ اٹھا کر تصویر دیکھنا اور ایک تفاخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تکنا بھی اچھا لگتا ہے۔

پسندیدہ کالم نگار

بطور ایک میگزین ایڈیٹر اخبارات کا مطالعہ میری ضرورت ہے اس لیے میں عموماً سب ہی اخبارات پر ایک نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ البتہ انگریزی میں صرف ڈان ہی دیکھتا ہوں۔ کالم کے لیے زیادہ تر نائنٹی ٹو نیوز، دنیا اور جنگ کے کالم تو ضرور دیکھتا ہوں، نوائے وقت میں صرف نصرت جاوید اور اسلم خان، انہیں نیٹ پر ہی پڑھ لیتا ہوں۔ ہارون الرشید صاحب اپنے اسلوب کے منفرد طرز کی وجہ سے ہمیشہ ہی توجہ کا مرکز رہے اور ارشاد حقانی صاحب مرحوم تو میرے پسندیدہ تجزیہ نگار تھے۔ ناجی صاحب کا کرافٹ کمال کا ہے، ان سے اتفاق کریں یا اختلاف، پڑھنا ضرور پڑتا ہے۔ عطاالحق قاسمی صاحب کے مزاحیہ کالم بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ جنگ میں ان کے علاوہ مسعود اشعر، رضا علی عابدی اور وجاحت مسعود کے کالم دیکھتا ہوں۔ بعض کالم تو اس لیے بھی دیکھنا ضروری ہوتے ہیں کہ ان کے دلائل کا رد اور نقطہ نظر کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے۔ ارشاد احمد عارف کے کالم جواب ''92 نیوز'' میں آرہے ہیں پہلے سے بہت مختلف انداز میں لکھے گئے ہیں، اس لیے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جاوید چوہدری نے اردو کالم نویسی کو متاثر کیا ہے، مگر اب ان کے پاس شاید زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اپنی وفات سے پہلے پروین شاکر نے بھی جنگ میں کچھ کالم لکھے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو ضرور ایک معروف اور قابل ذکر کالم نگار ہوتیں ان کے یہ چند کالم بھی ان کی شاعری کی طرح پرکشش تھے۔ دنیا اخبار میں خورشید احمد ندیم کے کالم لازمی پڑھتا ہوں، وہ توازن اور دلیل کے ساتھ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مکتوب یورپ کے نام سے بیرسٹر نسیم احمد باجوہ کو پڑھا، اچھا لگا۔ خالد مسعود صاحب بہت اچھا لکھ سکتے ہیں، اگر وہ وقت نکال پائیں۔ ایکسپریس میں نصرت جاوید کے کالم اچھے لگے تھے، اگرچہ بہت سے کالموں سے اختلاف ہوتا تھا۔ اایاز امیر ''اپنے اچھے دن'' غضب ڈھاتے ہیں۔ خلیل ملک مجھے ایک ایسے کالم نگار لگتے تھے جو حب جاہ کی وجہ سے پاور کوریڈورز میں چلے گئے، ورنہ ان میں ٹیلنٹ بلا کا تھا، ویسے وہ انڈر ریٹیڈ کالمسٹ ہی رہے۔

ٹی وی پر چہرہ نمائی

ٹی وی پر پہلی بار مجھے پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں جانے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد بھی سرکاری ٹی

Scanned with CamScanner

پروین شاکر میں ابن انشا جیسی شگفتگی اور بے ساختگی تھی، اچانک موت نے انہیں مقبول کالم نگار نہ بننے دیا

ٹی وی پر کچھ پروگرام کئے۔ ایکسپریس نیوز شروع ہوا تو ایک پروگرام کالم کار کے نام سے چلتا رہا۔ اس میں عباس اطہر، ہارون الرشید اور عبدالقادر حسن مستقل ارکان کے طور پر موجود تھے، جبکہ چوتھے کے لئے ہر بار کسی نہ کسی کالم نگار کو بلایا جاتا۔ میں نے بھی بعض پروگراموں میں شرکت کی۔ وہ پروگرام یوٹیوب پر موجود ہیں، اس لئے اکثر کوئی نہ کوئی اس حوالے سے پوچھ لیتا ہے۔ سینئر صحافی سجاد میر صاحب نے نیوز ون لاہور سے اپنا صبح کا پروگرام شروع کیا تو مجھے خاص پروگراموں میں بلایا۔ سجاد میر کا رویہ بھی ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ انہوں نے اپنے پروگرام میں میرے بیشتر کالموں کا فراخدلی سے ذکر کیا، جن سے اتفاق تھا، ان پر صاد اور بعض پر اپنے اختلافی کمنٹس بھی دیئے۔ ان جیسے کہنہ مشق کالم نگار اور صحافی کی جانب سے میرے کسی کالم کا حوالہ دیا جانا بھی بہت حوصلہ افزا لگتا۔ سجاد میر صاحب کے پروگرام میں شرکت ایک اور اعتبار سے مزے دار ہوتی کہ وہ ناشتہ کرائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ چینل نوٹنی پر انہوں نے پروگرام کیا تو یہاں بھی ہفتہ دس دن میں ایک بار ضرور بلا لیتے۔ یہاں پر بھی وہی ناشتہ کا سلسلہ چلتا بلکہ کئی بار تو ناشتے کے بہترین مراکز میں لے جاتے۔ میر صاحب کا کھانے کا ذوق بہت عمدہ ہے، انہیں معلوم ہوتا ہے کہ دیسی ناشتہ فلاں جگہ ملتا، اور انگریزی ناشتہ فلاں ریستوران میں ملتا ہے۔ نیوز ون کے دنوں میں تو جس روز میں صبح کے پروگرام میں شامل ہوتا، اس روز عمران خان کے بہنوئی اور جنگ کے کالم نگار حفیظ اللہ نیازی صاحب سی ٹی سی (کافی اینڈ ٹی کمپنی) کے مشہور روایتی ریستوران میں ناشتے پر مدعو کرتے۔ نیازی صاحب کی محبت نے ہمیشہ دل کو موہ لیا۔ اتنی شفقت، محبت اور عزت کے ساتھ وہ میرے کالموں کا ذکر کرتے کہ ان کی فراخدلی پر حیرت ہوتی۔

صحافت کن لوگوں سے سیکھی

صحافت میں میرا کوئی ایسا Mentor اور گارڈ فادر تو نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ میں نے صحافت میں کئی لوگوں سے سیکھا ہے اور وہ اساتذہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا آغاز اردو ڈائجسٹ سے ہوا تو الطاف حسن قریشی اور ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سے اردو ڈائجسٹ کے دنوں میں بہت کچھ سیکھا۔ الطاف صاحب خاص طور پر جس طرح اپنی تحریر پر نظر ثانی کرتے، ایک مثالیت پسند لکھاری کی طرح بار بار اسے خوب سے خوب تر بنانے میں لگے رہتے، اس نے بڑا متاثر کیا۔ الطاف صاحب ہمارے استادوں کے استاد ہیں۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو مبالغہ آمیز الفاظ میں سراہتے اور اس طالب علم کا خون سیروں بڑھانے کا موجب بنتے۔ یہی رویہ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کا ہے۔

الطاف حسن قریشی صاحب کی ایڈیٹنگ بہت شاندار ہے۔ انہوں نے اردو ڈائجسٹ کے ایک

Scanned with CamScanner

خاص شمارے میں الطاف گوہر صاحب کی کتاب ایوب راج کے دس سال کی تلخیص کی، وہ کمال تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گوہر صاحب نے خود وہ تلخیص کی ہو۔ قریشی صاحب تحریر اور ایڈیٹنگ پر بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔ وہ مسودے کی ایڈیٹنگ اس انداز سے کرتے ہیں کہ صفحات پر ایک جال بچھا دیتے ہیں۔ سرخیوں کے اعتبار سے بھی ان کی بہت صلاحیت ہے۔ یہی چیز میں نے ہارون الرشید صاحب میں بھی دیکھی ہے۔ جب یہ روزنامہ دنیا میں ایڈیٹر تھے تو انہوں نے میرے کالم ایڈٹ کیے۔ ہارون الرشید کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر ایک اچھا سب ایڈیٹر ہی اصل صحافی ہے۔ ایک بار ہارون صاحب نے بتایا کہ جب میں اخبار میں کالم بھیج چکا ہوتا ہوں تو اگلے روز شائع ہونے سے پہلے اسے دس مرتبہ پڑھتا ہوں، اگرچہ کوئی غلطی نظر آئے تو وہ تبدیل نہیں ہو سکتی، مگر آئندہ کے لئے وہ غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جو سیکھنا چاہیے۔ ارشاد احمد عارف کو اچھا تجزیہ نگار اور کالم نگار سمجھتا ہوں۔ وہ جس طرح کڑیوں کو جوڑ کر تجزیہ کرتے ہیں وہ انہی کا خاصا ہے۔ 92 میڈیا گروپ میں وہ بڑے عہدے پر ہیں اور اتنے بڑے عہدے پر آ کر انسان میں فرق آ جاتا ہے لیکن وہ اسی طرح درویش صفت انسان ہیں جیسے پہلے تھے۔ ان کی اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحت لوگوں کی زندگی آسان بناتے ہیں ان پر دباؤ نہیں ڈالتے۔ میں نے ارشاد احمد عارف کے تجزیے اور ان کے تحریری اسلوب کو بڑی اہمیت دی ہے۔ ان کا جو کرافٹ ہے اور جس انداز سے وہ چیزوں کو جوڑتے ہیں اس نے مجھے متاثر کیا۔ پانامہ کیس سے لے کر آج کل کے دنوں تک میں نے ان کے درجنوں تجزیے درست ہوتے دیکھے، مگر وہ کبھی کریڈٹ نہیں لیتے، حد سے حد مسکرا کر دیکھ لیا کہ وہ بات درست نکل آئی ناں۔ ان میں صبر و تحمل بھی کمال کا ہے۔ بعض اوقات مختلف فورمز میں ایسی ایسی دھواں دھار بحثیں ہوتی ہیں لیکن ارشاد احمد عارف جس تحمل سے تنقید کو سنتے ہیں وہ انہی کا خاصا ہے۔ میں نے بہت کم لوگوں میں یہ چیز دیکھی ہے۔

اور یا مقبول جان نے بھی ہمیشہ اسی شفقت، محبت اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ ان کی بعض آرا سے مجھے اختلاف رہا، کبھی ان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر کالم بھی لکھا، مگر انہوں نے نہ کبھی برا منایا نہ کچھ کہا۔ ہمیشہ خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ ملتے، بہت بار فون کر کے کالم کی داد دیتے اور سراہتے۔ اردو ڈائجسٹ میں ہی محسن فارانی صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ محسن فارانی بہت محنتی صحافی اور ادیب ہیں۔ افسوس ہے کہ فارانی صاحب کو ان کا صحیح مقام نہیں ملا لیکن وہ بہت بڑے سکالر ہیں۔ ان کا یوں تو بڑا کام ہے کہ لیکن انہوں نے دار السلام میں جو سیرت انسائیکلوپیڈیا پر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اردو ڈائجسٹ میں ایک اور سینئر تھے امین اللہ دشیر، یہ بھی بڑے سکالر تھے اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ یہ الطاف حسن قریشی صاحب کے بڑے اچھے دوست تھے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

روزنامہ جنگ میں نیوز روم میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام شروع کیا، اس کے بعد روزنامہ ایکسپریس میں آ گیا اور یہاں تو مجھے کوئی سکھانے والا نہیں تھا بلکہ وقت نے ہمیں ہی انچارج اور پھر سینئر بنا دیا۔ جواد نظیر ہمارے سینئر ایڈیٹر تھے اور ان سے بہت کچھ سیکھا بھی۔ میں نے ارشاد عارف صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ ہمارا لکھاریوں کا ایک فورم سی این اے (کونسل آف نیشنل افیئرز) ہے۔ یہ گزشتہ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجیب الرحمان شامی صاحب سے زیادہ برداشت کسی میں نہیں، ان کے حسن اخلاق نے میرے جیسے ناقدین کو ان کا مداح بنایا

اٹھارہ بیس سال سے کام کر رہا ہے۔ میں 2004ء میں اس کونسل کا باقاعدہ ممبر بنا۔ ایوان اقبال میں اس کی ہر ہفتے ایک نشست ہوتی ہے جس میں سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے۔ اس میں بڑے اچھے لکھاری اور تجزیہ نگار ہیں۔ مجیب الرحمٰن شامی صاحب بھی ان میں شامل ہیں۔ غلام مصطفیٰ میرانی اس کے چیئرمین ہیں، سجاد میر، ڈاکٹر مغیث الدین جیسے لوگ اس میں شامل ہیں۔ یہاں پر میں نے پروفیسر ہمایوں احسان جیسے انسان سے بہت کچھ سیکھا۔

زمانہ طالب علمی میں جس کالم نگار اور تجزیہ نگار سے بہت متاثر رہا وہ ارشاد احمد حقانی مرحوم تھے۔ میں روزنامہ جنگ میں کام کرتا تھا اور حقانی صاحب سے ملاقات کر سکتا تھا لیکن میں اس معاملے میں ذرا گریزاں رہتا ہوں۔ میں نے مولانا صلاح الدین احمد کا ایک جملہ کہیں پڑھا تھا کہ جو لوگ آپ کے فیورٹ ہوں ان سے ملنے سے گریز کریں کیونکہ اس سے بت ٹوٹنے کا ڈر رہتا ہے۔ نذیر ناجی ایک بہت بڑا نام ہے۔ میں نے ان کے ساتھ روزنامہ دنیا میں بہت کام کیا ہے لیکن جب میں نے ان کے ساتھ کام شروع کیا وہ ان کا اینڈ تھا اور اب ان میں وہ چیز نہیں رہی تھی جس کی شہرت ہم نے سنی تھی۔ ظاہر ہے کہ عمر کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے اور جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے انسان کی صلاحیتیں معدوم ہوتی جاتی ہیں۔ یا شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو بہت بڑا نام لگتا ہو وہ اتنا بڑا ہوتا نہیں ہے۔ ویسے جو ناجی صاحب کا پرانا دور تھا مجھے وہ بہت پسند تھا۔ ان کا کرافٹ بہت اچھا تھا۔ تحریر میں اللہ نے انہیں خاص ملکہ دیا تھا۔ وہ بڑا جامع کالم لکھتے تھے۔ بلکہ ایک دور میں تو مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جاوید چودھری اور نذیر ناجی کے سٹائل کو مکس کر کے لکھا جائے تو ایک خوبصورت کالم بن سکتا ہے۔ دنیا میں یہ دیکھا کہ بطور گروپ ایڈیٹر نذیر ناجی پر وور کرتو ہیں، مگر ان میں مزاحمت کی حس ختم ہو چکی تھی، وہ فائٹ نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا انہیں پنجابی محاورے کے مطابق لائی لگ اور کانوں کا کچا دیکھا۔ دو تین لوگ تھے جن کا کام ہی ناجی صاحب کو مخبری کرنا تھا اور وہ مزے سے ان کی سرپرستی کرتے۔ ان کی یادداشت بھی بہت کم رہ گئی تھی، دو تین بار ایسا ہوا کہ کسی درخواست پر انہوں نے دستخط کر دیئے، مگر پھر بھول گئے اور کہنے لگے کہ نہیں میں نے تو نہیں کئے تھے، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایسے میں آدمی بھونچکا رہ جاتا ہے کہ اتنے سینئر آدمی کو اب کیا کہے؟ دنیا سے عدنان عادل کو انہوں نے بلا جواز نکلوایا اور اس کے لئے اڑ گئے، حالانکہ عدنان عادل قابل آدمی ہیں، ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔

جنگ کے نیوز روم میں عثمان یوسف کہتے سب ایڈیٹر کو علم دشمن ہونا چاہیے، ہم اپنی لکھی تحریریں ان سے چھپاتے تھے۔ خاور نعیم ہاشمی تخلیقی نیوز ایڈیٹر تھے، وہ سازشی بھی نہیں رہے، ویلنٹائن ڈے کے تصور کو انہوں نے مقبول بنایا تھا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عباس اطہر زیرو مطالعہ کے ساتھ لکھتے تھے

صحافت میں کچھ نام ایسے ہیں جن کا بہت بڑا نام ہے لیکن وہ حقیقت میں بڑے تھے نہیں۔ یہاں پر میں عباس اطہر صاحب کی مثال بھی دے سکتا ہوں۔ یہ بہت بڑے کارڈ فادر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی خبریں اور سرخیاں تو بہت مشہور تھیں اور ان میں کچھ صلاحیتیں بھی تھیں۔ ان میں ایک بڑی صلاحیت یہ تھی وہ کہ بالکل زیرو مطالعہ کے ساتھ لکھتے تھے۔ پڑھنا انہیں بالکل بھی پسند نہ تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ ایک اتنا بڑا کالم نگار اور صحافی ہے اور یہ مطالعہ بالکل نہیں کرتا۔ وہ کتابوں کو بالکل ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے اسسٹنٹ نے کسی موضوع پر انہیں کئی صفحات کے پرنٹ نکال دیئے، حیران ہو کر عباس اطہر بولے کاکا میں نے تو ساری زندگی اتنا نہیں پڑھا جتنی تم نے مجھے یہ فائل تھما دی ہے۔ کہنے لگے کہ بھائی دو چار سطروں کی سمری نکال کر دو بس وہی کافی ہے۔ مجھے عباس اطہر صاحب کی جو چیز سب سے بری لگی وہ بڑے ہی روایتی انداز میں سیاست کرتے تھے اور اپنے دھڑے بناتے تھے۔ وہ اس حوالے سے ایک دیہاتی مزاج رکھتے تھے۔ میرے خیال سے ایک اچھے صحافی کو ان چیزوں سے بہت بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے اور ان سطحی چیزوں سے باہر آنا چاہیے۔

عباس اطہر کا بے رحم سنسر

عباس اطہر میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر ایک سے بڑی بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔ وہ بے تکلفی میں گالی بھی دے دیتے ہیں لیکن مجھے انہوں نے ہمیشہ عزت کے ساتھ پکارا۔ شاید انہیں میرے مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں روزنامہ ایکسپریس میں عباس اطہر کا سنسر بہت بے رحم تھا۔ اس وقت تو اس کی بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔ پیپلز پارٹی کا دور تھا۔ عباس اطہر زرداری صاحب کے دوست تھے، انہوں نے اخبار میں ایک خاص اور بہت ہی سخت قسم کا سنسر نافذ کر دیا۔ آصف زرداری، سلمان تاثیر، رحمان ملک وغیرہ کے خلاف کچھ نہ چھپ سکتا۔ این آر او سمیت پیپلز پارٹی کی کرپشن کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ صرف ان کی حمایت میں لکھنا ممکن تھا۔ سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ عباس اطہر جعلی ڈگریوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھنے دیتے تھے۔ کیونکہ پیپلز پارٹی ان دنوں جعلی ڈگریوں کو ڈیفنڈ کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ جن کلاز یوں نے میچ فکسنگ کی تھی ان کے خلاف بھی ہم کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ جوے کے خلاف کچھ نہیں لکھ سکتے تھے، اس کی ایک خاص وجہ ہے، لاہور کے صحافی یہ بات سمجھ جائیں گے۔ ان حالات میں میرے جیسوں نے یہ طریقہ نکالا کہ سیاست پر لکھنا ہی کم کر دیا۔ نئے ایریاز ڈھونڈے۔ لٹریچر، روحانیت، سپورٹس، پرسنالٹی مینجمنٹ، کامیابی، سائنس، عسکریت پسندی، فلم وغیرہ پر کالم لکھنے لگا۔ یوں ان موضوعات پر لکھنے کی استعداد بہتر ہوتی گئی اور چونکہ اخبار میں زیادہ تر کالم سیاسی ہوا کرتے تھے، یہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے غیر سیاسی کالم پسند کیے جانے لگے۔ ایک نئی ریڈرشپ میری بن گئی، جس کی محبت بعد میں بھی برقرار رہی۔

عباس اطہر (شاہ جی) کانوں کے بہت کچے تھے، ہم حیران ہوتے تھے کہ اتنا بڑا آدمی ہے اور اس قدر چھوٹی حرکتیں کرتا ہے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ خالی کیسٹ ہیں جو بھی سب سے پہلے اس کیسٹ کو بھر لے یہ اسی کی ہے۔ عباس اطہر صاحب کے پاس بہت سے لوگ جا کر بیٹھتے تھے لیکن میں ان کے پاس

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

برسوں لاہور شہر میں ویگنوں پر دھکے کھائے
پرانی موٹر سائیکل گھسیٹی، اللہ کے فضل
سے ترغیبات غلبہ نہ پاسکیں

زیادہ نہیں جاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میں بغیر کسی کام کے ان کے پاس کیوں جا کر بیٹھوں۔ کوئی ضرورت ہوگی تو جاؤں گا۔ عباس اطہر کو لوگ میرے متعلق کہا کرتے تھے کہ دیکھیں اس میں نخرہ بڑا ہے، آپ کے پاس آ کر نہیں بیٹھتا۔ لوگوں کو اپنی جاب کے تحفظ کے لیے اور اپنے خلاف پروپیگنڈے سے بچنے کے لیے مجبوراً شاہ جی کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھنا پڑتا تھا۔ میرے خیال سے یہ عادتیں کسی بڑے آدمی میں نہیں ہونی چاہئیں۔ ہم نے ایسی عادت نہ تو شامی صاحب میں دیکھی اور نہ ہی ارشاد احمد عارف صاحب میں۔ عباس اطہر صاحب جیسی خامیاں نذیر ناجی میں بھی ہیں۔ دنیا اخبار میں ایک لابی میرے خلاف متحرک رہتی تھی۔ ناجی صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ میرے کام کی تعریف کرتے تھے اور کبھی میرے خلاف لابی کا حصہ نہیں بنے۔ شاید انہیں میرا کام پسند آ گیا تھا۔ ویسے یہاں پر دنیا ٹی وی کے مالک میاں عامر محمود کی تعریف کرنا چاہوں گا، پانچ برسوں میں انہوں نے ایک بار بھی کوئی سخت جملہ نہیں کہا بلکہ ہر سالگرہ کی تقریب میں میرا نام لے کر تعریف کرتے۔ وہ شائستہ اور بڑے دل والے آدمی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صحافی کا بڑا دل ہونا چاہیے۔
ویسے عباس اطہر صاحب کا میرے ساتھ مجموعی رویہ شفقت والا رہا۔ ان کا ایک خاص مزاج تھا، دوسروں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے بات کرتے، ایک خاص شفیق انداز میں گالی بھی دے دیا کرتے۔ مجھے کبھی تم کہہ کر بھی نہیں پکارا، حالانکہ ہم ان کے بچوں سے بھی چھوٹے تھے، انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا مزاج مختلف ہے، انہوں نے گروپ ایڈیٹر ہونے کے باوجود شفقت آمیز انداز میں برتاؤ کیا۔ ایسا کبھی کچھ نہیں کہا، جس سے تکلیف پہنچے۔ انسان اپنی خامیوں، خوبیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، شاہ جی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، لیکن ان کے اوصاف نہ گنوانا بھی ناانصافی ہوگی۔ آج وہ مٹی اوڑھے تاج پورہ کے قبرستان میں سو رہے ہیں۔ شاہ جی! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے ریگولر کالم شروع کرائے، خاص جگہ دی، فری ہینڈ دیا، آپ کی وجہ سے ہی میں نے ''غیر سیاسی'' کالم لکھنا بھی سیکھ لیا۔ شکریہ۔ اللہ آپ کی روح کو سکون دے۔

''یزید کی شہادت''

عباس اطہر سرخی کے بادشاہ تھے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ صدر صدام حسین کی پھانسی پر جو انہوں نے کالم لکھا تھا اس کی سرخی بڑی زبردست تھی اور ایسی سرخی ایک تخلیقی بندہ ہی نکال سکتا ہے۔ اس کالم کا عنوان تھا: ''یزید کی شہادت''۔ کیسی منفرد بات ہے کہ شہادت اور وہ بھی یزید کی۔ یعنی ایک ایسے بندے کی شہادت ہوئی جو بہت ہی متنازع تھا۔ ان کی کامن سینس بہت زیادہ تھی۔ وہ مطالعہ تو بالکل بھی نہیں کرتے تھے، زیر مطالعہ کے ساتھ لکھتے تھے اور کمال کر دیتے تھے۔ ان کا فہم بہت اچھا تھا۔ ان کے

Scanned with CamScanner

قارئین کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کا تو سرے سے مطالعہ ہی نہیں ہے۔

بے رحم سنسر کا فائدہ

عباس اطہر کے بے رحم سنسر شپ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے تان پولیٹکل موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا اور اس میں میری مہارت بہت بڑھ گئی۔ انہی دنوں میں نے پاکستان میں پروان چڑھنے والی عسکریت پسندی اور دہشت گرد تنظیموں پر بہت لکھا۔ میں نے طالبان کو بہت پڑھا اور ان کی تحریک پر تجزیے کیے۔ افواج پاکستان کے خلاف لڑنے والے دہشت گردوں اور شدت پسندوں پر تجزیے کیے کہ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں۔

میجر عامر کا تبصرہ

میرے ان تجزیوں کے حوالے سے ایک مرتبہ ہارون الرشید صاحب کے صاحبزادے کی شادی پر معروف عسکری تجزیہ نگار، آئی ایس آئی کے مشہور افسر اور افغان امور کے ماہر میجر عامر نے کہا تھا کہ "اٹک پل کے اس پار پنجاب میں طالبانائزیشن پر سب سے زیادہ اور سب سے اچھا خاکوانی نے لکھا ہے"، اس میز پر سجاد میر اور کراچی کے صحافی محمد طاہر بھی بیٹھے تھے، وہ گواہ ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ یہ سب میں نے اپنے تجزیے کی بنیاد پر لکھا تھا۔ میرے پاس تو کوئی خاص ذرائع بھی نہیں تھے، کوئی ایجنسی بھی سرپرستی کرنے والی نہیں تھی اور اس معاملے میں میرا کوئی گرو نہیں تھا۔ اس لیے میں نوجوان صحافیوں اور لکھاریوں سے کہتا ہوں کہ آپ بہت زیادہ محنت کریں تو آپ آگے نکل سکتے ہیں۔ میں جب بھی لکھتا ہوں تو بہت زیادہ مطالعہ کرتا ہوں۔ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا ہوں اور عالمی اخبارات و جرائد کا بہت مطالعہ کرتا ہوں اور پھر اس پورے مطالعہ کو کیپسول کی صورت میں صرف ایک یا دو کالموں میں بیان کر دیتا ہوں۔ اکثر نوجوان پوچھتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کے لیے کتاب تجویز کر دیں۔ بھائی کوئی ایک کتاب کسی کے لیے بھی تجویز نہیں کی جا سکتی۔ یہ کوئی نسخہ اور سمری نہیں ہے کہ آپ کو بنا کر دی جائے اور آپ ایکسپرٹ ہو جائیں۔ اس کے لیے بہت زیادہ محنت اور ہر قسم کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

مجیب الرحمٰن شامی کا ظرف

مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی شخصیت میں میں نے بڑا حوصلہ اور اعلیٰ ظرف دیکھا ہے۔ وہ نوجوانوں اور اپنے سے بہت جونیئرز کو بہت ہی زیادہ عزت دیتے ہیں۔ یہ خوبی ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ شفقت اور حوصلہ افزائی کے حوالے سے مجیب الرحمن شامی صاحب سرفہرست ہیں۔ ایک زمانے میں میرا ان کے ساتھ پسند، ناپسند کا رشتہ تھا۔ ان کی تحریر کا میں دیرینہ مداح تھا، کالم لکھنے کا ان کا اسلوب ہمیشہ سے پسند تھا۔ شامی صاحب کی بعض آرا سے البتہ شدید اختلاف تھا۔ مجھے لگتا کہ رائیٹ ونگ کے ان جیسے لکھاریوں نے وقت گزرنے کے ساتھ رائیٹ ونگ کو بے آسرا چھوڑ دیا۔ نوجوانی کا زمانہ تھا، شدت زیادہ تھی۔ جہاں موقعہ ملتا، شامی صاحب کے حوالے سے سخت الفاظ استعمال کرتا۔ وہاں لازمی کرتا، جن کے بارے میں اندازہ ہوتا کہ وہ بات آگے پہنچا سکتے ہیں۔ اس گھٹیا قسم کے عامیانہ رویے کے جواب میں مجیب الرحمٰن شامی کا رویہ یکسر مختلف اور نہایت مشفقانہ رہا۔ جہاں ملتے میرے کالموں کی تعریف کرتے، حوصلہ افزائی کرتے اور دوسروں کے ساتھ اتنا فراخدلانہ تعارف کراتے کہ من ہی من میں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عباس اطہر کے پی اے نے بتایا کہ۔

ہارون صاحب نے آپ کے کالم کی بڑی تعریف کی

شاہ جی سے کہا، ایہہ مُنڈا بڑا اچھا کالم لکھدا اے

شرمندگی ہوتی۔ ایسا کئی بار ہوا کہ کالم نگاروں کی کسی تقریب میں میں حسب عادت پیچھے بیٹھ گیا، شامی صاحب نے دیکھا تو آواز لگا کر آگے بلایا اور سب کے ساتھ بھرپور تعارف کرایا۔ اپنے ناشتے کی روایتی محفل میں بلا لینا اور کئی کالموں پر باقاعدہ فون کر کے فیڈ بیک دینا..... یہ سب ایسے کام تھے، جن کی وجہ سے میرے دل میں شامی صاحب کی عزت بڑھ گئی اور غصہ بتدریج تحلیل ہوتا گیا۔ کئی بار مجھے لگتا ہے کہ شامی صاحب کی پذیرائی اور مقبولیت کی ایک وجہ ان کا حسن اخلاق بھی ہے۔

ہارون الرشید۔ فسوں خیز قلم کار

ہارون الرشید صاحب ایکسپریس سے وابستہ ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار دفتر آتے اور گروپ ایڈیٹر سید عباس اطہر کے کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکتے رہتے، کبھی رائٹنگ پیڈ منگواتے اور نہایت تیز رفتاری سے آدھ پون گھنٹے میں کالم لکھ ڈالتے۔ ان جیسا تیز اور پرفیکٹ لکھنے والا کم ہی دیکھا۔ شاہ جی سے ان کی نوک جھونک بھی چلتی رہی، چائے کی چسکیوں، سگریٹ کے کش اور کاغذوں پر گری راکھ ہٹا کر وہ لکھتے رہتے۔ ہم جیسے خاموشی، رشک اور عقیدت سے اس فسوں ساز قلم کار کو دیکھتے رہتے۔ بات کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ ایک دن شاہ جی (عباس اطہر) کے پی اے نے بتایا کہ ہارون صاحب نے آپ کے کالم کی بڑی تعریف کی اور شاہ جی کو کہا ہے کہ ایہہ منڈا عامر خاکوانی بڑا اچھا کالم لکھدا اے، آئینڈیاز اس کے اچھوتے ہوتے ہیں۔ یہ سن کر حیرت ہوئی کہ چلو کسی سینئر کو تو تعریف کرنے کی ہمت ہوئی۔ ایک دو دن بعد ہارون صاحب ہمارے میگزین سیکشن میں چلے آئے۔ بے تکلف انداز میں گپ شپ کرتے رہے، چائے پی، سگریٹ پھونکی اور پھر چلے گئے۔ یہ ہارون الرشید صاحب سے اس خاکسار کے تعلق کا آغاز تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ نہایت محبت، شفقت سے ملتے۔ ایکسپریس چھوڑ کر جنگ چلے گئے، مگر محبت کا تعلق قائم رہا۔ میرا جو کالم اچھا لگتا اس کی تعریف کرتے، گاہے صبح فون کر کے کالم پر تبصرہ کرتے۔ ان کے اسلوب کا میں بڑا مداح تھا، جی چاہتا تھا کہ ایسا اسلوب ہمارا بھی ہو، یہ مگر سمجھ آ چکی تھی کہ ویسا لکھنا ممکن نہیں۔ ہارون صاحب اپنے بے تکلف حلقے میں استاد ہارون یا استاد کے نام سے مشہور ہیں۔ ہمیں کبھی شاگرد بنانے کی کوشش نہیں کی، برابری کی سطح پر، شائستگی اور نہایت گرم جوشی سے ملتے۔ ہارون صاحب کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے کبھی سٹائل بدلنے کا مشورہ نہیں دیا، وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے، جس سے سیروں خون بڑھ جاتا۔ لاہور آتے تو ان دنوں نیشنل ہوٹل میں قیام رہتا۔ فون کر کے بلا لیتے اور پھر شام کو گھنٹوں گپ شپ رہتی۔ مختلف واقعات سناتے، پرانے صحافیوں کے قصے، اپنے تجربات، مختلف سیاسی، علمی شخصیات پر آرا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ عمران خان کی کتاب پر کام شروع کیا تو دو ڈھائی مہینے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لاہور میں جم کر بیٹھ گئے۔ روزانہ کام ہوتا، شام کو بلا لیتے، ان کے نیاز مند کبھی حلیم، کبھی مچھلی اور کبھی کوئی اور خاص ڈش لے کر آتے، ہارون صاحب کم کھاتے ہیں، مگر کھانے کا بڑے رومانی انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے کشمیریوں کے بارے میں لکھا تھا کہ انہوں نے کھانوں کو بھی اپنے رومانس کا حصہ بنا لیا۔ ہارون صاحب کا بھی یہی انداز ہے، شیزان سے دیسی چوزو کا شوربا، نشاط کی چانپیں، حاجی صاحب کی حلیم، غلام رسول کے چنے اور نجانے کہاں کہاں کے روایتی کھانوں کا ذکر کرتے اور اشتہا بڑھاتے ہیں، جب یہ آجائیں تو چند لقمے لے کر سیر ہو جاتے ہیں، میٹھا البتہ مرغوب ہے، وہ منگوا کر رکھ لیتے اور ہر گھنٹے دو بعد ایک دو چمچہ کھا لیتے ہیں۔ ہارون الرشید صاحب کے ساتھ درجنوں بلکہ بیسیوں شامیں گزریں۔ ان کے حوالے سے صحافتی حلقوں میں کئی افواہیں مشہور تھیں، یار لوگ ان کی شاموں کے بارے میں طنزیہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ تبصرے کرتے۔ میں تو خدا لگتی بات کروں گا کہ کبھی ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے تو انہیں شام کو پروفیسر احمد رفیق اختر کی بتائی ہوئی تسبیحات پڑھتے دیکھا، تسبیح ہاتھ میں لئے وہ تصوف پر گھنٹوں بولتے رہتے، مزے کی بات ہے کبھی خود دعویٰ نہیں کیا کہ روحانیت حاصل ہوئی یا میرے اوپر کوئی روحانی واردات گزری۔ میرا مشاہدہ تو نہایت مثبت رہا، جس کی گواہی دے سکتا ہوں۔ ہارون صاحب سے ان ملاقاتوں، نشستوں میں بہت کچھ سیکھا۔ شکریہ ہارون صاحب، آپ نے ایک طالب علم کو ہمیشہ عزت دی، شفقت کے ساتھ پیش آئے اور کبھی دل شکنی نہیں کی۔

جاوید چودھری۔ پسند بھی، اختلاف بھی

جاوید چودھری صاحب مجھے بطور کالم نگار بہت پسند ہیں۔ انہوں نے روایتی انداز میں کالم لکھنے کے بجائے اس کے سکوپ کو بہت زیادہ وسعت دی ہے۔ اس میں بہت زیادہ اضافے کیے ہیں۔ چودھری صاحب نے کالموں میں ایسا رنگ ڈالا ہے اور ایک ایسی روایت ڈالی ہے جس سے ہمارے لیے بھی آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایسے کالموں پر "بابے صحافی" ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جاوید چودھری صاحب کے اکثر کردار بات کرتے ہوئے قہقہہ کیوں مارتے ہیں۔ کیا ہم اپنی زندگی میں بات بات پر یوں قہقہہ لگاتے ہیں، ہرگز نہیں۔ لیکن چودھری صاحب کے کردار ہر بات پر قہقہہ ہی لگاتے ہیں بھلے وہ کتنی ہی افسردہ اور فکر انگیز بات کیوں نہ ہو۔ چودھری صاحب سے مجھے دوسرا اختلاف یہ ہے کہ وہ اپنے کالموں کے آخر میں پاکستان کے حوالے سے بہت زیادہ مایوسی پھیلاتے ہیں اور دوسری قوموں کو قابل رشک قرار دیتے ہیں۔ میرا یہ نقطہ نظر ہے کہ مایوسی کے بجائے امید پیدا کی جائے، فیک نہ ہو جینوئن امید اور اس کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ میرے خیال میں جاوید چودھری نے اردو کالم نگاری کو فائدہ پہنچایا یا نقصان بھی کم نہیں پہنچایا، اتنی زیادہ بے بنیاد کہانیاں گھڑیں کہ اب ہم کوئی سچی کہانی بھی لکھیں تو قاری یقین نہیں کرتا۔ چودھری صاحب نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی، مگر اسے گنوایا بھی، اگرچہ ڈیجیٹل میڈیا پر وہ آج بھی پاپولر ہیں۔ یہاں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ذاتی طور پر میرے ساتھ جاوید چودھری صاحب کا رویہ ہمیشہ بہت اچھا رہا۔ ہمیشہ بہت اچھے سے ملے۔ ایک آدھ بار کسی سوشل میڈیا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جذباتیت نہ پھیلائی جائے، دلیل سے بات کی جائے، بہت زیادہ مذہبی حوالے نہ دیئے جائیں

پوسٹ میں ان پر تنقید کی تو شکوہ بھی ایسے شائستہ انداز سے کیا کہ مجھے وہ پوسٹ فوری طور پر ہٹاتے ہی بنی، اس لئے ذاتی طور پر مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں بلکہ وہ مہربان رہے ہیں، میری یہ تنقیدی رائے ایک قاری کے طور پر ہے۔ اسی طرح حسن نثار صاحب کا بڑا زبردست کرافٹ ہے۔ لیکن ان میں بھی کمسانیت بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک ہی جیسے موضوع پر ایک ہی انداز میں لکھتے جا رہے ہیں۔ حسن نثار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایک ہی کالم دس ہزار بار لکھ چکے ہیں۔ اللہ ان کے قارئین پر رحم فرمائے۔ میں کہتا ہوں کہ اپنی ریڈرشپ کو سرپرائز دیا جائے اور عام موضوعات سے ہٹ کر کسی انوکھے موضوع پر بھی لکھا جائے۔ میرا یہ بھی نقطہ نظر ہے کہ جذباتیت نہ پھیلائی جائے اور دلیل سے بات کی جائے۔ بہت زیادہ مذہبی حوالے اور جذباتی باتیں نہ کی جائیں۔ اخلاقی دلائل دیئے جائیں۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے کالموں میں دلیل اور غیر جذباتی انداز میں بات کروں۔ رؤف طاہر صاحب بھی ہمارے سی این اے کے ساتھی ہیں، نہایت دیانتدار، شریف النفس انسان۔ ان کی یادداشت کمال کی ہے، اپنے کالموں میں ایسے ایسے حوالے دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مسلم لیگ ن کے زبردست حامی، مگر کوئی ان کی دیانت داری پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ہمیشہ محبت سے ملتے ہیں اور اچھے لفظوں میں پیٹھ پیچھے بھی یاد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ صحافت میں کم ملتے ہیں۔

اخبار نویسوں میں کئی لوگ ایسے ہیں کہ ان کی شرافت، نجابت اور مطالعہ کا میں مداح رہا ہوں۔ مظفر محمد علی جنگ پبلشر کے انچارج تھے، نہایت شریف النفس شخص، جب بھی ملا نہایت محبت سے ملے۔ افسوس کہ زندگی کے آخری برسوں میں انہیں خاصی تکلیف سہنی پڑی۔ اسی طرح خالد حمایوں صاحب کے ساتھ کبھی کام نہیں کیا، مگر ان کے مطالعہ، ذہانت اور تحقیقی ذوق کا قائل ہوں۔ لاہور میں پرانی کتابوں کے جوہریوں میں سے ایک وہ بھی ہیں، ان کی کتاب دوستی اور ذوق مطالعہ خوب ہے۔ محسن فارانی اردو ڈائجسٹ کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے، ان کا نہیں اور بھی ذکر آیا، فارانی صاحب بہت اچھے، شریف آدمی ہیں، کمال درجے کے محقق، سکالر۔ افسوس کہ اردو روزنامہ صحافت میں وہ ایڈجسٹ نہ ہو سکے، آج کل وہ دارالسلام میں کام کر رہے ہیں، آج تک اسی سائیکل پر ہیں، درویش منش مگر علم کی دنیا کے حقیقی مسافر۔ فارانی صاحب کے لئے دل میں بڑی عزت ہے۔ جنگ کے نیوز روم کے دنوں میں جی آر اعوان صاحب کے ساتھ کام کیا، اعوان صاحب بڑے اچھے، شریف انسان ہیں، آج کل نوائے وقت کے میگزین انچارج ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں، بدقسمتی سے میگزین جرنلزم کی طرف بڑی تاخیر سے آئے، نہایت دیانت دار صحافی۔ جنگ ہی میں طارق جاوید صاحب نیوز ایڈیٹر تھے، جلدی دنیا سے چلے گئے، ان جیسا شریف، بھلا مانس شخص میں نے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نہیں دیکھا۔ یاور عباس صاحب بھی جنگ کے نیوز روم میں تھے، بڑے بھلے مانس، اچھے صحافی۔ وہاں پر ذرے شفٹ میں عبدالرحمن جامی صاحب تھے، آج کل وہ ہمارے اخبار کے ادارتی سیکشن میں ہیں، جامی صاحب بڑے صاحب مطالعہ انسان ہیں۔

پروفیسر ہمایوں احسان، جینوئن دانشور

لاہور کے سفید بالوں والے پروفیسر۔ دانشور، قانون دان، پاکستان لا کالج کے بانی سربراہ۔ پروفیسر ہمایوں احسان سے ملاقات سی این اے میں ہوئی۔ ان کے علم، دانش اور خاص کر آؤٹ آف باکس تھنکنگ نے بہت متاثر کیا۔ بہت سے معاملات میں ہمایوں صاحب سے آؤٹ آف باکس سوچنا سیکھا۔ ان کی گفتگو کے میں باقاعدہ نوٹس لیا کرتا۔ ایسے انوکھے نکات اٹھاتے کہ آدمی ششدر رہ جاتا۔ بلا مبالغہ وہ لاہور کے چند جینوئن دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے میڈیا اور انٹیلی جنشیا نے ایسے نابغہ روزگار شخص کی قرار واقعی قدر نہیں کی، ورنہ انہیں سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا۔ ہمایوں صاحب کے میرے اوپر گہرے فکری اثرات پڑے۔

کرامت علی بھٹی، اعلیٰ پائے کا انٹرویو نگار

صحافی، اعلیٰ پائے کا انٹرویو نگار اور عمدہ تجزیہ کار۔ کرامت بھٹی ایکسپریس میگزین میں ہمارے ساتھ تھے۔ بہ لحاظ منصب میں انچارج تھا، مگر بھٹی صاحب نے ایسا کمال کا دوستی کا تعلق بنایا کہ پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں بھی قطعی اثر نہیں پڑا اور دوستوں والی قربت، گہرائی اور خلوص بھی برقرار رہا۔ کرامت بھٹی ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے بغیر زندگی کا تصور محال سا لگتا ہے۔ آج کل وہ نجی کاروبار میں الجھ گئے ہیں، مہینوں ملاقات نہیں ہوتی، مگر لگتا ہے جیسے ہر لمحے کا ساتھ چل رہا ہے۔ میرے جیسا سست آدمی دفتر سے نکلنے کا روادار نہیں تھا، کرامت بھٹی ہی مجھے کھینچ کر لے جاتا۔ کبھی ہمایوں احسان کے پاس، کبھی ڈاکٹر عاصم یا ڈاکٹر اظہار ہاشمی سے ملاقات اور ایک زمانے میں شام کو حیدر فاروق مودودی کی محفل میں شرکت، ہر ماہ جناب کے ایم اعظم کے عشائیہ میں شرکت اور ان کی گفتگو سے لذت کشید کرنا۔ کرامت نے کالموں کے حوالے سے ہمیشہ نہایت مفید اور کارآمد مشورے دیئے، جو کالم پسند نہیں آیا، اس پہ بے لاگ تبصرہ کرتا بلکہ بے رحمی کی حد تک سیدھا تبصرہ۔ ہر کچھ عرصے کے بعد ایک الگ میٹنگ کرتا، جس میں نشاندہی کی جاتی کہ کہاں کہاں کمزوری رہی، کون سی تحریر بہتر تھی اور کیسے مجموعی تاثر اچھا بنایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کرامت بھٹی جیسے مخلص دوست اور نقاد کے بغیر میرے کالموں میں ایک آنچ بلکہ شاید کئی آنچوں کی کسر رہ جاتی۔ کالم کی ایڈیٹنگ کرامت کی شاندار تھی، لفظوں کو یوں کفایت کے ساتھ برتتا اور خاص تاکید ہوتی کہ قاری کے لئے سانس لینے کی گنجائش (Breathing Space) برقرار رکھی جائے۔

ڈاکٹر عاصم اللہ بخش میں مومنانہ فراست

ڈاکٹر عاصم تعلیم کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں، مگر انہوں نے میڈیکل کی پریکٹس نہیں کی، سول سروس کا امتحان پاس کر کے ملازمت نہیں کی اور وہ ٹیکسٹائل کے بزنس سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر عاصم اللہ بخش سے میری ملاقات اخوت کے بانی ڈائریکٹر اور معروف سماجی رہنما ڈاکٹر اظہار ہاشمی نے کرائی۔ ڈاکٹر اظہار ہاشمی اور ڈاکٹر امجد ثاقب کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے، جو کئی اعتبار سے میرے محسن ہیں، ہر کڑے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

محمود الحسن نہ ہوتا تو میرے کئی کالم نہ لکھے جا سکتے، اس کی کتابوں کی متواتر سپلائی ہمیشہ جاری رہی

وقت میں ساتھ کھڑے ہونے والے اور ان کی شخصیات میں وہ خلوص، کمٹمنٹ اور دردمندی ہے کہ چند منٹ ساتھ رہنے والا بھی سوشل سروس کرنے کا سوچنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر امجد ثاقب، ڈاکٹر اظہار ہاشمی اور ہمایوں احسان سب اخوت کے بانی ڈائریکٹرز ہیں، میری خوش قسمتی کہ سب سے فیض یاب ہوا، ان کی محبتوں کا قرض دار ہوں۔ بات ڈاکٹر عاصم اللہ بخش کی ہو رہی تھی، وہ لاہور کے جینوئن دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ قدیم و جدید پر ان کی گہری نظر ہے۔ باقاعدہ صوفی نہ ہونے کے باوجود صوفی منش، قرآن پر گہری نظر، اقبال حرز جان، فلسفہ، مغربی علوم پر گہری نظر اور سیاسی و سماجی مسائل کا نہایت عمدہ تجزیہ..... ان کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے۔ ڈاکٹر عاصم کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ مومن کی فراست سے کیا مراد ہے۔ ان کا بہت سے معاملات میں تجزیہ اور آرا بعد میں یوں درست ثابت ہوئیں جیسے وہ صاحب کشف ہوں اور ان کا کشف درست نکلا۔ ڈاکٹر عاصم سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے کالموں اور میری فکر پر ان کے نہایت گہرے، ان مٹ اثرات مرتب ہوئے۔ خاص کر توازن، دلیل اور اعتدال کی خصوصیات ان سے مکالمہ کر کے سیکھیں۔

محمود الحسن، ایک کتاب دوست انسان

یہ نوجوان ایکسپریس میں پہلے عباس اطہر صاحب کے اسسٹنٹ کے طور پر آیا، پھر میگزین کا حصہ بنا۔ محمود الحسن سے زیادہ کتاب دوست اور مطالعہ کا شائق کم ہی دیکھنے کو ملا۔ مجھے شروع ہی سے محمود چھوٹے بھائیوں کی طرح اچھا لگا۔ پڑھنے کا بے پناہ جنون تھا، کتابیں اس کے پاس بہت تھیں، آدھی سے زیادہ تنخواہ انہی پر خرچ کرتا۔ پھر اسے دوسروں کو پڑھوانے، علمی مدد کرنے کا بھی جنون تھا۔ آپ کسی موضوع پر لکھنا چاہ رہے ہیں، اس سے ذکر کر بیٹھیں، دیوانہ وار مدد کے لئے متحرک ہو جائے گا، اپنی لائبریری سے ریفرنس بکس ڈھونڈ لائے گا، کہیں سے کوئی حوالہ، نیٹ سے کوئی اور حوالہ، اس کا بس نہیں چلتا کہ دوسروں کی زندگی کس طرح آسان بنا دے۔ محمود نہ ہوتا تو میرے کئی کالم نہ لکھے جا سکتے۔ اس کی کتابوں کی متواتر اور آزادنہ سپلائی ہمیشہ جاری رہی۔

ملک فیض بخش، امید کا دیا

کالم نویسی کے تجربے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ لکھنا ایک پیکیج ڈیل ہے، جس میں کئی لوگ معاون ثابت ہوتے ہیں، اگرچہ کریڈٹ انہیں نہیں مل پاتا، فرنٹ پر ایک ہی لکھاری یا کالم نگار ہوتا ہے، مگر قدرت کا اپنا ایک نظام کام کرتا اور کئی لوگوں کو اس کے قریب کر دیتا ہے، ان کی معاونت، حوصلہ افزائی اور مدد سے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ کم از کم میرے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا۔ سی این اے کے دوستوں کے علاوہ میرے میگزین کے ساتھیوں نے بڑا ساتھ دیا۔ نیوز روم سے ایک صاحب ملک

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فیض بخش صاحب تھے، جو ہمارے پاس میگزین میں تشریف لاتے اور ہمیشہ کھل کر حوصلہ افزائی کرتے، بعد میں وہ ادارتی شعبہ کا حصہ بن گئے۔ ابتدا کے دنوں میں جب لکھنے والے پر عدم اطمینان اور بے یقینی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، ملک فیض بخش انہی دنوں میں امید، حوصلہ افزائی کا لائیٹ ہاؤس بن کر آتے اور امید بندھا کر چل دیتے۔ ورنہ نیوز روم کے بیشتر لوگ، حتیٰ کہ میگزین کے ایک ابتدائی ساتھیوں کا رویہ نہایت حوصلہ شکن تھا۔ وہ یوں تاثر دیتے جیسے کبھی میرا کوئی کالم پڑھا ہی نہیں۔ پڑھ لیتے تو کسی کو فیڈ بیک دینے کی توفیق نہ ہوتی۔ یہی حال پریس کلب میں تھا۔ معلوم نہیں صحافتی کمیونٹی میں اس قدر حسد اور منفی سوچ کیوں ہے؟ البتہ پریس کلب میں دو سینئر صحافی ایسے تھے، جنہوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ایک مشرق کے سابق ایڈیٹر عزیز مظہر مرحوم اور دوسرے قریشی صاحب۔ عزیز مظہر کیفے میریا میں بیٹھے ہوتے تو اپنی میز پہ بلا لیتے۔ ایک دن کمال مہربانی سے کہنے لگے کہ آپ نے ایکسپریس میں جو مباحث چھیڑے ہیں، ان میں وہی رنگ اور چمک نظر آئی جو کسی زمانے میں زینو (صفدر میر) نے لکھے تھے۔ یہ بات سن کر میرا اعتماد جس قدر بڑھ گیا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ صفدر میر لیجنڈری صحافی تھے، ان سے میرا کیا موازنہ ہو سکتا ہے، مگر عزیز مظہر صاحب کا یہ حوصلہ افزائی کا انداز بھلا لگا۔ عزیز مظہر صاحب برسوں پہلے چلے گئے، ملک فیض بخش کا چند ماہ پہلے انتقال ہوا، بڑا دکھ ہوا۔ بشیر واثق اور عبیداللہ عابد۔ ابتدائی دنوں میں تو نہیں، مگر بعد میں میگزین سیکشن میں بشیر واثق، عبیداللہ عابد وغیرہ بھی حصہ بنے۔ یہ نوجوان پڑھنے لکھنے والے تھے، عبید عابد کا تعلق جمعیت سے رہا تھا، اس سے بڑی بحثیں چلتی رہتیں۔ بشیر واثق نے خاص کر میرے ایک نجی معاملے میں بہت مدد کی اور پریشانیوں کے ایک فیز میں بڑا ساتھ دیا۔ اس کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

اکثر نئے لکھنے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ ان کی تحریروں کی اصلاح کروں۔ اس حوالے سے میں نئے لکھنے والوں سے کہوں گا کہ بھئی سچی بات یہ ہے کہ کالم نگاری میں اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس میں استاد شاگرد والا روایتی معاملہ نہیں چلتا۔ یہ شاعری نہیں کہ جس کی اصلاح کی جا سکے۔ کسی کے پاس وقت نہیں اور خاص طور پر میرے جیسا پروفیشنل اخبار نویس غریب آٹھ گھنٹے ملازمت کرے، اپنے کالم کی بھی فکر کرے اور شاگردوں کی اصلاح بھی کرے، ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ ہمارا مشورہ یہی ہے کہ صحافت اور کالم نگاری میں کسی مینٹور کو ڈھونڈنے کے بجائے خود زیادہ سے زیادہ محنت کی جائے اور اچھے مصنفین کو پڑھا جائے، ان سے سیکھا جائے۔ جتنا آپ کا مطالعہ ہوگا اتنا ہی فائدہ ملے گا۔

میرا فلمی ذوق۔ پسندیدہ اداکار اور پروڈیوسر

آخر میں کچھ فلمی ذوق کی بات بھی ہوئی۔ میں فلموں کا قائل ہوں۔ یہ انسانی جذبات اور شخصیت کے اندرونی تضادات سے روشناس کراتی ہیں۔ فکشن بھی یہی کام کرتی ہے۔ مگر بعض جگہوں پر فلم زیادہ موثر انداز سے چیزیں دکھاتی ہیں۔ ابتدا میں تو فلموں کے متعلق میرا ذوق عام سا تھا۔ وہی جیمز بانڈ کی فلمیں، ایکشن، تھرلر وغیرہ پسند تھیں۔ ہمارے گھر میں 1990ء تک ٹی وی نہیں تھا۔ جب میں نے گریجوایشن کر لیا تو ٹی وی آیا۔ والد صاحب کا نقطہ نظر تھا کہ ٹی وی بچوں کی پڑھائی پر اثر انداز ہوتا ہے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسٹیبلشمنٹ امریکہ، یورپ، پاکستان
بھارت ہر جگہ ہے یہ پالیسیوں کے
تسلسل کی علامت سمجھی جاتی ہے

اور پڑھائی سے توجہ بھٹکا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اسی کے عشرے والی بھارتی فلمیں نہیں دیکھیں۔ امیتابھ بچن کا عروج، کشور کمار کے گانے وغیرہ نہ دیکھ سن سکا۔ دوست ذکر کرتے تھے لیکن میں ان سے اجنبی رہا۔ بہت بعد میں شعلے اور ایک آدھ اس زمانے کی مشہور فلم ریکارڈ درست رکھنے کے لیے دیکھ لی۔ ٹی وی ڈرامے بھی اس زمانے میں نہیں دیکھے۔ کسی عزیز کے گھر پر کبھی دیکھ لیا تو دیکھ لیا۔ جب میں 1996ء میں مستقل لاہور آ گیا تو یہاں پر چند ایک ایکشن فلمیں سینماؤں میں دوستوں کے ہمراہ دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر ایک ایسے دوست ملے جنہوں نے آرٹ فلموں کی طرف متوجہ کیا۔ ہاسٹل میں سرگودھا کے ڈاکٹر مجید انجم میرے دوست تھے۔ یاد رہے کہ ہم دونوں ہی آؤٹ سائیڈر کے طور پر رہ رہے تھے۔ ڈاکٹر مجید نے مجھے گلزار کے جادو سے متعارف کروایا۔ شیام بینیگل اور دیگر معروف بھارتی آرٹ فلم ڈائریکٹرز کی فلمیں دکھائیں۔ گلزار کی اجازت، موسم ، ناجائز، ماچس وغیرہ جیسی فلمیں دیکھیں۔ سمیتا پاٹیل، شبانہ اعظمی، فاروق شیخ، نصیر الدین شیخ کی مختلف فلمیں، کمال ہاسن کی پشپک مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بعد میں ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھتا رہا۔ پھر بعد میں فیس بک گروپ ''مووی پلینٹ'' کی وجہ سے فلم کا تناظر وسیع ہوا۔ ادھر ''ٹورنٹ'' سے فلمیں ڈاؤن لوڈ کرنے کا اندازہ ہوا تو ایک نئی دنیا سامنے آئی۔ ابتداء میں چند نامور اداکاروں کو فالو کیا۔ ان کی فلمیں نیٹ پر سرچ کر کے دیکھتا رہا۔ مارلن برانڈو، الپچینو (دونوں کی فلم گاڈ فادر میری آل ٹائم فیورٹ ہے)، رابرٹ ڈی نیرو، ٹام کروز، لیونارڈو ڈی کیپریو، بریڈ پٹ، میٹ ڈیمن، جولیا رابرٹس، میرل سٹریپ وغیرہ کی فلمیں تو میں نے تلاش کر کر کے دیکھیں۔ دراصل ایک بڑا اداکار عام طور پر بڑے پراجیکٹ کا حصہ ہی بنتا ہے۔ رابرٹ ڈی نیرو کے کریڈٹ پر ریجنگ بل، گڈ فیلاز، ہیٹ، انڑش مین وغیرہ، اور جیسے الپچینو نے گاڈ فادر کی تینوں فلموں میں کام کیا۔ سکار فیس، ڈیولز ایڈووکیٹ، آنرش مین وغیرہ جبکہ ڈی کیپریو کے کریڈٹ پر بہت سی مشہور فلمیں ہیں۔ ٹائی ٹینک، کیچ می اف یو کین، ایوی ایٹر، شٹر آئی لینڈ، گینگز آف نیویارک، انسیپشن، وولف آف وال سٹریٹ، ڈی پارٹیڈ، جینگو ان چینڈ، بلڈ ڈائمنڈ، ریوینینٹ، (اس پر آسکر ایوارڈ دیا گیا)۔ ونس اپان اے ٹائم ان ہالی ووڈ وغیرہ۔ بریڈ پٹ نے بھی کئی مشہور فلموں ٹرائے، ان گلوریس باسٹرڈ، سیون، فائٹ کلب، دی کیوریس کیس آف بنجمن بٹن، میٹ جو بلیک، مسٹر اینڈ مسز سمتھ، وغیرہ دیکھیں۔

میٹ ڈیمن نے گڈ ول ہنٹنگ جیسی فلم سے آغاز کیا اور پھر جیسن بورن سیریز سے نام کمایا، دی مارٹین، ڈی پارٹیڈ، فورڈ بمقابلہ فراری جبکہ رسل کرو (گلیڈی ایٹر، رابن ہڈ، انسائیڈر، اے بیوٹی فل مائنڈ فیم) اور ٹام ہینکس (کاسٹ اوے، فارسٹ گمپ،

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

سیونگ پرائیویٹ ریان، ڈاؤنچی کوڈ، دی ٹرمینل، دیپوسٹ، چارلی ولسن وار فیم) اور پھر کسی نے ڈینئیل ڈے لیوس کا بتایا تو اس کی مشہور فلمیں گینگز آف نیویارک، دیئر ول بی بلڈ، ان دی نیم آف فادر، فینٹم تھریڈ وغیرہ دیکھیں۔ اسے عظیم ترین اداکار کہا جاتا ہے۔ اس نے تین آسکر ایوارڈ جیتے ہیں۔ اسی طرح ڈینزل واشنگٹن ایک کمال اداکار ہے اسے بھی دو آسکر مل چکے ہیں۔ ٹریننگ ڈے، میلکم ایکس، فینسز، امریکن گینگسٹرز، گلوری، بک آف ایلی، ڈیجاوو، فلاڈیلفیا، مینچورین وغیرہ مشہور فلمیں دیکھیں۔ جارج کلونی کی فلمیں دیکھ کر میں متحیر رہ گیا۔ بڑے پائے کا اداکار ہے۔ ون فلیو اوور دی ککوز نیسٹ، ایز گڈ ایز اٹ گیٹس، دی پارٹیڈ، فیو گڈ مین، بکٹ لسٹ وغیرہ دیکھیں۔ میں نے جن فلموں کا ذکر کیا ہے یہ تو میں نے خود دیکھی ہیں۔ ورنہ ان بڑے اداکاروں کی اور بھی بہت سی فلمیں ہیں۔

مجھے شروع سے ایکشن یعنی رزمیہ فلمیں پسند ہیں۔ جنگوں پر بنی تاریخی فلمیں پسند ہیں۔ بریو ہارٹ، الیگزینڈر، ٹرائے، کنگ آرتھر، ہنڈرڈ، رائز آف ایمپائر، سنچورین، کنگڈم آف ہیون، پیٹریاٹ وغیرہ دیکھیں۔ اسی طرح جدید جنگوں پر بنی فلمیں سیونگ پرائیویٹ ریان، ہیکسا رج، برج آن ریور کوائی، پلاٹون، امریکن سنائپرز وغیرہ دیکھیں۔ ٹیکساس کے بیک گراؤنڈ میں کاؤ بوائے سٹائل کی ویسٹرن فلمیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ گڈ بیڈ اینڈ اگلی، ونس اپان اے ٹائم ان ویسٹ یا نیٹ فلیکس کی سیریز گاڈ لیس وغیرہ اچھی لگیں۔ گاڈ فادر، گاڈ فیلاز، آئرش مین، امریکن گینگسٹرز جیسی کرائم ایکشن فلمیں بھی اچھی لگیں۔

پھر بتدریج مجھے یہ سمجھ آئی کہ ڈائریکٹرز اور اداکار سے بھی اہم ہے۔ فرانسس فورڈ کپولا، مارٹن سکورسیس، انگمار برگمن، سرجی لیون، سپیلبرگ، کیو برک، جیمز کیمرون، کرسٹوفر نولان، سپائیک لی، کوئین برادرز، راب رائنر، گونزالیز گونزالیز، ٹاران ٹینو، صغر فرہادی وغیرہ اچھے ڈائریکٹر ہیں۔ ان سب کا اپنا ایک سٹائل ہے۔ اب میری دلچسپی سیزنز میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ گیمز آف تھرون پسند آیا۔ مگر ترک ڈرامہ ارطغرل نے حقیقی معنوں میں نشہ ڈال دیا۔ اس کا اپنا ایک مزا ہے۔ اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ ترکوں نے کمال انداز میں تاریخ، فکشن کے ساتھ اسلامی تہذیب، رہن سہن کو بھی دکھایا ہے۔ بچوں کی تربیت کے حوالے سے اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ ایک اور ترک ڈرامہ جو صوفی مزاج لیے ہوئے ہے۔ وہ یونس ایمرے ہے۔ یہ بھی پسند آیا۔ یونس ایمرے ترکی کے مشہور صوفی شاعر اور دانا تھے۔ یہ مولانا روم کے ہم عصر ہیں۔ لیکن انہیں ترکی سے باہر زیادہ شہرت نہ مل سکی کیونکہ انہوں نے مقامی زبان میں اظہار کیا۔ مارکو پولو، ہاؤس آف کارڈز، وائی کنگز ایسی مقبول سیزن ہیں جنہیں ہر کوئی دیکھ رہا ہے۔ مجھے بھی وقت ملے تو دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے پی ٹی وی کے پرانے ڈرامے بہت پسند ہیں آج کل کے ڈرامے نہیں اچھے لگتے۔ آج کل کے ڈراموں میں ہر جگہ ایک ہی انداز کا رونا دھونا یا پھر سازشیں۔ میں انٹرٹینمنٹ چینل بالکل نہیں دیکھتا۔ نیوز چینلز بہت کم دیکھتا ہوں۔ زیادہ تر وقت سپورٹس چینلز کو دیتا ہوں۔

بھارتی فلموں کا تذکرہ رہ گیا، میں ان کا مخالف نہیں، اچھی فلمیں جہاں بھی ہوں دیکھ لینی چاہئیں۔ بھارت میں آرٹ فلموں کا دور شاندار تھا، مگر اب کئی ایسے ہدایت کار ہیں جو کمرشل اور آرٹ کو ملا کر تجربات کر رہے ہیں جیسے وشال بھردواج، اس نے

میرے جیسے پروفیشنل صحافی کے لیے ممکن نہیں کہ
8 گھنٹے ملازمت بھی کرے، کالم کی بھی فکر کرے
اور شاگردوں کی اصلاح بھی کرے

شیکسپیئر کے تین شاہکار ڈراموں پر تین فلمیں بنائیں، میکبتھ پر مقبول، اوتھیلو پر اوم کارہ جبکہ ہیملٹ پر حیدر بنائی۔ مقبول میں عرفان خان اور تبو تھے، اوم کارہ میں اجے دیوگن، کرینہ کپور، سیف علی خان جبکہ حیدر علی شاہد کپور، تبو اور کے کے مینن کی فلم تھی۔ انوراگ کیشپ کے گینگز آف واسع پور بنا کر ہر ایک کو چونکایا، ان کی فلمیں مختلف ہوتی ہیں۔ رام گوپال ورما کی ستیا بھی ٹرینڈ سیٹر تھی، اس سے منوج واجپائی جیسا اداکار سامنے آیا۔ میں عرفان خان کا مداح ہوں، اس نے اپنے آپ کو ہر کردار میں منوایا ہے۔ عامر خان بھی مجھے پسند ہے، اس کی فلمیں کئی بار دیکھی جا سکتی ہیں، تھری ایڈیٹ، تارے زمین پر، پی کے، رنگ دے بسنتی، لگان وغیرہ۔ سلمان خان کا فین نہیں، مگر وہ مجھے شخصی طور پر بہتر لگتا ہے۔ شاہ رخ خان کی دل والے دلہنیا لے جائیں گے اور کبھی خوشی کبھی غم ایک سے زیادہ بار دیکھی، مگر شاہ رخ معلوم نہیں مجھے کیوں گھٹیا اور موقع پرست آدمی لگتا ہے جس نے اپنا گروپ بنا کر اپنی برتری بنائی۔ سلمان خان اور عامر خان ون مین آرمی ہیں۔ عامر خان نے اپنا ٹی وی شو سے بہت متاثر کیا۔ مشکل سے ہندی نام والے اس شو کو دیکھ کر سیکھنا چاہیے۔ میں ان چند بدنصیب لوگوں میں سے ہوں جو دلیپ کمار کے ڈائی ہارڈ فین نہیں۔ میرے نزدیک امیتابھ بچن دلیپ کمار سے بڑا اداکار ہے، اس نے بہت زیادہ اور بہت ورسٹائل کردار کیے اور اپنے آپ کو ابھی تک ان رکھے ہوئے ہے، دلیپ صاحب تو چالیس سال پہلے ہی سائیڈ پر ہو گئے، وہ نئے زمانے کے ساتھ نہیں چل پائے۔

مجھے اپنے صحافتی سفر کے دوران بہت کچھ تلخ و شیریں دیکھنا پڑا۔ تلخ کم اور شیریں زیادہ۔ اللہ کا خاص کرم ہے کہ کالم نگاری کے سفر نے بے پناہ مسرتوں اور خوشیوں سے ہم کنار کیا۔ ایک چھوٹے سے پسماندہ شہر کے رہنے والے لڑکے کو اللہ کریم نے قلم کے ذریعے ہزاروں، لاکھوں لوگوں تک پہنچایا۔ بے شمار نئے لوگ حلقہ محبت میں شامل ہوئے۔ دور دراز شہروں، قصبات، دیہات اور اوورسیز پاکستانیوں کی جانب سے جب محبت بھرے میسج، ای میلز اور سوشل میڈیا پیغامات آتے ہیں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ اللہ ہی ہے جو ہم جیسوں کا بھرم رکھتا ہے۔ اسی نے عزت دی اور وہی آگے بھی سرخرو رکھے گا۔ (ان شاء اللہ)۔ میں آخر میں نوجوان اور باذوق صحافی عبدالستار اعوان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ اس نوجوان نے بڑی لگن اور محبت کے ساتھ میرے خیالات و نظریات اور میری زندگی کے اہم شب و روز محفوظ کر دیے ہیں۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اتنے طویل انٹرویو اور بعض دیگر مواد کو ایسی خوبصورتی سے ملا کر یہ جامع انٹرویو بنا دے گا۔ میانوالی جیسے پسماندہ علاقے سے ابھر کر آنے والا یہ نوجوان ان شاءاللہ بہت آگے جائے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین

Scanned with CamScanner